جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مئی ۲۰۰۰

مُدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن



Partners in Progress
Business Opportunity
تحصیل سطح تک وسیع، پاکستان کا پہلا کوریئر نیٹ ورک
سمندر پار سروس
جدید ترین ذرائع حمل و نقل
کم سرمایہ والے افراد کی حوصلہ افزائی
امانت کے تصور سے آشنا تربیت یافتہ افرادکار
اگر آپ اپنے شہر میں اس جدید نیٹ ورک کو چلانے کا ارادہ
اور مالی صلاحیت رکھتے ہوں تو رابطہ کریں
ہر ضلع و تحصیل (بشمول کشمیر) سے بزنس پارٹنرز (ڈیلرز) مطلوب ہیں
ڈیلر شپ فارم (Information Kit) مبلغ ۷۵ روپے کے عوض منگوائے جا سکتے ہیں
(بذریعہ بینک ڈرافٹ اکاونٹ نمبر 60-8575 انڈس بینک اسلام آباد)
آخری تاریخ ۵ جون
CourierNet
FAST & SAFE
10-Bawal Market G-9 Markaz
Islamabad. Tel: 051-253708, Fax: 051-280108
E-mail: couriernet@hotmail.com
Designed by DigImage Ibd

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جلد ۳۲۷، عدد ۵، مئی ۲۰۰۰ء، صفر ۱۴۲۱ھ

مدیر: پروفیسر خورشید احمد　　نائب مدیر: مسلم سجاد

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۶

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زر سالانہ: ۲۰۰ روپے

بھارت ۳۵۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۵۰۰ روپے

مشرق وسطیٰ، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۷۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۵۰ روپے

بہانہ طلب منافقین

ہندستان کے تجدد نواز آپ کے اس فتوے پر قانع ہو جائیں گے کہ عندالضرورت چہرہ کھولنے کے باب میں شارع نے کوئی قطعی حکم نہیں دیا ہے۔ اس معاملے میں تمام تر قاضی و مفتی خود عورت ہے۔ آپ نے اس منزل تک ان کو پہنچا دیا۔ اب جو قبا میں چند بند رہ گئے ہیں ان کا فیصلہ ان شاء اللہ زمانے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی کشاکش اور نسوانی فقاہت کی مقراض تیز کر دے گی[1] ("پردہ" پر تنقیدی نظر' مولانا امین احسن اصلاحی' ترجمان القرآن جلد ۱۶' عدد ۳ - ۴' ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ' مئی و جون ۱۹۴۰ء' ص ۲۸۹' ۲۹۰)۔

---

[1] کسی شخص کو ماخوذ کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ اگر اس کی عبارت میں ثبوت جرم کی کافی گنجایش نہ ہو تو قطع و برید کر کے عبارت کو فرد قرارداد جرم کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ فاضل تنقید نگار نے دو جگہ مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں استثنائی صورتوں میں مطلق عورت کو قاضی و مفتی قرار دیتا ہوں۔ حالانکہ خود انھوں نے میری عبارت سے جو فقرے نقل کیے ہیں ان میں یہ الفاظ موجود ہیں: "ایک مومن عورت جو خدا اور رسولؐ کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے"۔ مطلق عورت اور مومن عورت میں جو عظیم الشان فرق ہے ایک صاحب علم آدمی اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ مگر اس قید کو اطلاق سے بدلنا شاید اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اس تحریف کے بغیر الزام ثابت نہ ہو سکتا تھا۔

رہا یہ اندیشہ کہ بہانہ طلب منافقین میری تعبیر قانون سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے' تو میں اس کو ناقابل التفات سمجھتا ہوں۔ منافق کے لیے کون دروازہ بند کر سکتا ہے؟ وہ اس کا محتاج کب ہے کہ میں یا آپ یا کوئی اور شخص اس کے لیے راستہ کھولے؟ اس کے لیے تو ساری شریعت گنجایشوں سے بھری پڑی ہے۔ جدھر سے چاہے نکل بھاگے۔ وہ چاہے تو تمام عمر زکوٰۃ نہ دے' کبھی حج نہ کرے' کبھی روزہ نہ رکھے' ہر رات ایک نئی عورت سے نکاح کرے اور صبح طلاق دے دے۔ شریعت کی کون سی حد ہے جس سے نکلنے کا راستہ وہ نہ پا سکتا ہو؟ شریعت کا قانون دراصل اس کے لیے بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ یہ تو صرف مومنوں کے لیے بنایا گیا ہے' اور اسی لیے منافقین کے واسطے اس میں ہر طرف راہ فرار موجود ہے۔ اگر ہم قانون کی تعبیر کرتے ہوئے اس خوف کو پیش نظر رکھیں کہ کہیں منافق کو اس میں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہ مل جائے' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی طرف سے قانون میں ان بندشوں کا اضافہ کریں جو شارع نے نہیں رکھی ہیں اور یہ شریعت کی تعبیر نہیں تحریف ہوگی (ابوالاعلیٰ مودودی)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات

نئے حالات‘ نئے تقاضے

پروفیسر خورشید احمد

صدر کلنٹن کا پانچ روزہ دورۂ بھارت‘ جس میں جاتے جاتے پاکستان میں پانچ گھنٹے قیام کی زحمت بھی شامل ہے‘ برعظیم ہی نہیں‘ پورے ایشیا کی سیاست میں امریکہ کے مستقبل کے کردار کے خدوخال نمایاں کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ یہ دورہ اس علاقے کے باب میں امریکہ کی گذشتہ چالیس پچاس سال پر محیط پالیسی میں جوہری تبدیلیوں کا پیامبر ہے۔ امریکی قیادت نے ”عبارت‘ اشارت اور ادا“ غرض ہر ہر طریقے سے اپنے عزائم اور نئی ترجیحات کا اظہار کر دیا ہے۔ بھارت سے دوستی اور پاکستان سے کشیدگی کا پیغام بڑا صاف اور معنی خیز ہے۔ امریکہ کا یہ رویہ پاکستانی قوم اور اس کی قیادت کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے۔

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری دیانت‘ حقیقت پسندی اور ملک و ملت سے وفاداری کے ساتھ امریکہ سے اپنے تعلقات‘ ماضی‘ حال اور مستقبل کا از سرنو جائزہ لیں۔ خوابوں اور تمناؤں کی دنیا سے نکلیں اور نئے حالات کی روشنی میں دن کی روشنی کی طرح روشن حقائق کے مطابق اپنے نظریاتی‘ سیاسی‘ معاشی اور تہذیبی مقاصد و مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے ایک جان دار‘ واضح اور دیرپا حکمت عملی وضع کریں۔ اس دورے کا اگر کوئی حقیقی پیغام ہے تو وہ یہ ہے کہ ”دوستوں میں سب سے قریبی دوست“ (friendliest of the friend) اور ”سب سے قریبی ساتھی“ (most allied ally) کی دوستی اور قربت کی حقیقت کو سمجھیں‘ ہوا کے رخ کو پہچانیں‘ خوش فہمیوں کی بھول بھلیوں سے نکلیں اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ فیصلے کی اس گھڑی کا فائدہ اٹھائیں‘ کسی تاخیر کے بغیر اپنی پالیسی اور اہداف کا تعین کریں اور ان کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ

سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ ایک باوقار اور آزادی کی قدر کرنے والی قوم کی حیثیت سے آج ایک نئے عزم اور واضح پالیسی کی ضرورت ہے۔ لیت و لعل اور ماضی کی طرح وقت گزاری سم قاتل ہوگی۔ دوستی کے مجهول اور مبہم خوابوں کی دنیا سے نکلنا اور مردانہ وار اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے نئے عزم اور نئے پروگرام کی تشکیل امت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ امریکہ سے دوستی کے پچاس سالہ دور کا بے لاگ جائزہ' اور امریکہ کی نئی ترجیحات اور دوستی کے نئے دروبست کی روشنی میں اپنے مقام اور اپنے اہداف کا تعین ہی ہماری اولیں ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ پاکستان ملت اسلامیہ پاک و ہند کی جمہوری جدوجهد اور بے پناہ قربانیوں کے نتیجے میں قائم ہوا ہے اور اللہ کی دی ہوئی اس امانت کی اصل امین ملت اسلامیہ پاکستان ہے۔ جو کام اس وقت درپیش ہے یہ کسی ایک فرد کے کرنے کا نہیں۔ نہ ہی اسے چند نام نہاد دانش وروں' سول سرونٹس' فوجی جرنیل یا این جی اوز کے کرتا دھرتا حضرات پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ قوم کو کرنا ہے اور کھلی بحث اور قومی اجماع (consensus) کی بنیاد پر کرنا ہے اور ہر مصلحت سے بالا ہو کر کرنا ہے۔ چونکہ اس فیصلے پر ہماری آزادی' سلامتی اور باعزت قومی زندگی کا انحصار ہے' اس لیے کسی کو یہ حق اور اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی قسمت سے کھیلے۔ موجودہ فوجی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قوم کو اعتماد میں لے اور اس کے تاریخی عزائم' ملی جذبات اور قومی سلامتی کے تصورات کے مطابق خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کرے جو حقیقی قومی یک جہتی اور اتفاق رائے پر مبنی ہو۔

اس وقت مرکزی مسئلہ امریکہ سے تعلقات کے منہج کا ہے لیکن ناگزیر ہے کہ اس میں بھارت اور دوسری عالمی قوتوں سے تعلقات بھی زیر بحث آئیں۔ اس وقت عالمی سیاست کا جو نقشہ زیر تشکیل ہے اس کے پس منظر میں یہ سارا کام ہونا ہے' اس لیے خارجہ پالیسی کے سارے ہی پہلوؤں پر اس وقت از سرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ وقتی یا نمایشی اقدامات کا نہیں بلکہ طویل عرصے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر پالیسی سازی کے اہتمام کا ہے۔ یہ کام بند کمروں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر کھلی بحث ہو اور حکومت بھی پوری قوم اور اس کے معتمد نمایندوں کو مشورے میں شریک کرے تاکہ حقیقی قومی پالیسی وجود میں آسکے۔ بیرونی مبصر بھی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ اس وقت پاکستانی قوم کے افکار' اس کی خواہشات اور جذبات اور مغربی سیاست سے وابستہ اور انگلش میڈیم کلاس کے احساسات جدا جدا ہیں۔ ہفت روزہ اکانومسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں کلنٹن کے اس دورے کے پس منظر میں پاکستانی قوم کے مخمصے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے صرف نظر بہت بڑی افتاد پر منتج ہو سکتا ہے:

یہ بات واضح ہونے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے کہ جناب کلنٹن نے پاکستان کو ٹھنڈا کیا ہے یا مشتعل

کیا ہے۔ پاکستان کے انگریزی زبان کے اخبارات نے جو پاکستان کے آیندہ رخ کے بارے میں کلنٹن کے ہم خیال ہیں' اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا تقریباً خیر مقدم کیا۔ اردو پریس نے جو عوامی رائے سے زیادہ قریب ہے' اس پر بھارت کو پرچانے کا الزام لگایا ہے (اکانومسٹ' یکم اپریل ۲۰۰۰ء' ص ۶۱)۔

بات صرف اردو پریس کی نہیں۔ انگریزی پریس میں بھی عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنے والی تحریریں آتی ہیں' چاہے تعداد میں کم ہوں۔ اصل مسئلہ مخصوص طبقات کی خواہشات یا مفادات کا نہیں' بحیثیت مجموعی قوم کے جذبات' احساسات' عزائم اور امنگوں کا ہے اور عوام کی مرضی سے بے پروا ہو کر اگر کوئی راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ تصادم اور تباہی کا راستہ ہے' جس سے بچنا بہتر ہے۔

اس لیے ہم سب سے پہلے ان دو باتوں کا برملا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ:

۱- اولیں ضرورت پاک امریکی تعلقات کے بے لاگ جائزے اور قومی عزائم' سلامتی اور آزادی کے تقاضوں کے حوالے سے واضح اور دیرپا پالیسی کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ شترمرغ کی طرح زمین میں سر چھپانے' کبوتر کی طرح خطرے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے اور گیدڑ کی طرح خائف ہو کر دم ہلانے میں آزادی اور عزت داروں کی موت ہے۔ ضرورت شیر کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کی ہے لیکن یہ کام پوری حقیقت پسندی' بالغ نظری اور دیرپا اثرات کو نگاہ میں رکھ کر کرنے کا ہے۔

۲- پالیسی کے جائزے اور تشکیل نو کا کام نہ صرف یہ کہ قومی عزائم اور مفادات کی روشنی میں انجام پانا چاہیے بلکہ اس موقف کو اختیار کرنے اور اس پر جم جانے کی ضرورت ہے جس کی تشکیل قومی اتفاق رائے سے ہو۔ قوم کو اعتماد میں لیا جائے اور اس کی موثر شرکت سے پالیسی سازی انجام دی جائے۔ یہ کام محض وزارت خارجہ یا چیف ایگزیکٹو کے سیکرٹریٹ کا نہیں' اس میں قوم کے تمام حقیقی نمایندوں کی شرکت اور ان کا اطمینان ضروری ہے۔ وہی فیصلہ قائم رہ سکتا ہے جو قومی سوچ پر مبنی ہو اور جسے اجتماعی ضمیر کی پشت پناہی حاصل ہو اور یہی اسلام اور جمہوریت کی روح ہے۔

ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ صدر کلنٹن کا دورہ کامیاب رہا یا ناکام؟ گو دورے کے بعد سے اس موضوع پر بھارت اور پاکستان ہی نہیں' یورپ اور خود امریکہ میں بھی بڑی لے دے ہو رہی ہے۔

برعظیم کا یہ دورہ صدر کلنٹن کا اپنے دورہ صدارت کا باسٹھواں (۶۲) دورہ تھا اور جس تام جھام اور شاہی کروفر سے اس کا اہتمام کیا گیا اس میں یہ منفرد تھا۔ صدر کے ایرفورس ون کے ساتھ ۶۷ جہازوں کا ایک قافلہ پرشکوہ تھا جو امریکہ کی ایرفورس کی کارگو ڈویژن کا ایک تہائی ہے۔ محض جہازوں نے چار دن تک

روزانہ ۵۰ پروازوں کے ذریعے وہ سارا سازوسامان اور عملہ کے افراد بھارت پہنچائے جو جمہوری صدر کی حفاظت پر مامور تھے۔ خفیہ اداروں کے ۱۰۰' ۲۰۰ جوان ۳۰ بلٹ پروف گاڑیاں' دو فوجی ٹرک' ایک درجن ہیلی کاپٹر حتیٰ کہ بستر' پانی اور حفاظتی کتوں کا لشکر ہر لمحہ خدمت پر کمربستہ رہے۔ جمہوریت اور مساوات کے اس پیامبر کے صرف ایک سفر پر ۷۵ ملین ڈالر خرچ آئے۔ گویا جمہوری صدر نے بادشاہی دور کی یادگار تاج محل کو دیکھنے والے سفر پر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالا جو تاج محل کی تعمیر پر خرچ ہوا ہو گا۔ اس سب کے باوجود امریکی تجزیہ نگار صاف کہہ رہے ہیں کہ جن مقاصد کے لیے یہ دورہ کیا گیا تھا اور جن کا اظہار خود صدر کلنٹن نے اپنے اس مضمون میں کیا تھا جو ۲۰ مارچ ۲۰۰۰ء کے انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون میں شائع ہوا تھا' یعنی دنیا کے خطرناک ترین علاقے کو جنگ کے خطرات سے پاک کرنا' نیوکلیر عدم پھیلاؤ کی امریکی پالیسی پر بھارت اور پاکستان کی آمادگی' اور کشمیر کے مسئلہ کے حل کی کوئی راہ نکالنا' ان اہداف کی حد تک کلنٹن خالی ہاتھ واپس گئے ہیں اور ناقدین کے جواب میں سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں یوں برس پڑے کہ "میرے کامیاب نہ ہونے کی وجہ سینیٹ میں ری پبلکن پارٹی کا سیاسی کھیل ہے جس نے سی ٹی بی ٹی کی توثیق نہ ہونے دی"۔ اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز' واشنگٹن پوسٹ' واشنگٹن ٹائمز' سبھی نے یک زبان ہو کر اس دورے کو سب سے زیادہ مسرفانہ اور امریکہ کے اس علاقہ میں اہداف کے اعتبار سے ناکام قرار دیا ہے۔ ہفت روزہ ٹائم نے اس کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ:

> بل کلنٹن جنوبی ایشیا کے دورے سے واپس آئے ہیں تو دہلی میں خوشی و مسرت ہے' اسلام آباد میں ناامیدی' اور کشمیر میں مایوسی کی کیفیت ہے۔ امریکی صدر اپنے ساتھ تحائف سے بھرا ہوا سوٹ کیس لائے اور جسے وہ آج کی دنیا کا خطرناک ترین علاقہ کہتے ہیں' اس کی سفارتی بارودی سرنگوں سے بچ آنے پر سکون محسوس کر رہے ہیں۔ دورے کے نتیجے میں کلنٹن اس سے زیادہ خطرناک علاقہ چھوڑ کر آئے ہیں جتنے خطرناک علاقے میں وہ گئے تھے (۳۰ اپریل' ۲۰۰۰ء)۔

اور مستقبل کے بارے میں ٹائم کی پیش گوئی یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں کلنٹن کے مشورے پر عمل نہیں کرتیں تو:

> آنے والے مہینوں میں دہلی کی خوشیاں غم میں اور اسلام آباد کی ناامیدیاں مایوسی میں تبدیل ہو جائیں گی اور کشمیریوں کی مایوسی علیٰ حالہ رہے گی۔

یہ کام امریکہ کے ارباب حل و عقد کا ہے کہ وہ سوچیں کہ امریکہ نے اس دورے سے کیا پایا اور کیا کھویا۔ واشنگٹن ٹائمز نے تو کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے اس دورے کو مہنگی ناکامی (costly failure) قرار دیا ہے لیکن پاکستان کے لیے اس میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اگر اب بھی ہماری قیادت اور امریکہ پر

ایمان رکھنے والے بااثر طبقات کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو کم از کم پاکستانی قوم کی حد تک اپنی ساری کج مہری' بدذوقی' طوطا چشمی اور ہتک آمیزی کے باوجود یہ تلخ تجربہ ایک محفوظ' قابل اعتماد اور کامیاب تر مستقبل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بات گلے شکوے سے آگے جا چکی ہے اور ہمارے لیے بحیثیت قوم ضروری ہو گیا ہے کہ توقعات رکھنے کے چکر سے نکل کر حقائق کا مقابلہ کریں اور اپنی راہ خود نکالنے کے باعزت رویے پر سختی سے قائم ہونے کا عزم کریں۔

امریکہ سے تعلقات کے موجودہ دور کا آغاز ۱۹۵۰ء میں وزیراعظم لیاقت علی خاں کے دورہ امریکہ سے ہوا جو مارچ ۲۰۰۰ء میں صدر کلنٹن کے دورہ بھارت پر ختم ہو گیا۔ امریکہ نے پہلے چار سال (۱۹۵۰-۵۴ء) پوری کوشش کی کہ پاکستان' بھارت اور افغانستان یکساں پالیسی اختیار کریں اور پاکستان جنوبی ایشیا کی ایک ریاست کی حیثیت سے آگے بڑھے اور یہ تینوں مل کر دوسری جنگ کے بعد کی سیاست میں امریکہ کا ساتھ دیں۔ امریکہ کی بے پناہ خواہش اور کوشش تھی کہ بھارت اس کا ساتھ دے اور اشتراکی دنیا کے گرد جو حصار امریکہ بنانا چاہتا ہے اس میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن پنڈت نہرو نے کسی صورت میں بھی اس نظام کا حصہ بننے کے لیے آمادگی کا اظہار نہ کیا بلکہ انڈونیشیا اور چین کے ساتھ مل کر غیر جانب دار تحریک (non-aligned movement) کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جو امریکی پالیسی کے خلاف تھی۔ پاکستان' خود اپنی حکمت عملی کے تحت' جنوبی ایشیا سے زیادہ اپنے کو وسطی ایشیا اور شرق اوسط کا حصہ سمجھتا تھا اور انھی ممالک کے درمیان اپنے مستقبل کا کردار دیکھ رہا تھا۔ ان حالات میں ۱۹۵۴ء میں پاکستان امریکہ کے وفاقی معاہدوں سیٹو (Seato) اور سینٹو (Cento)' بغداد پیکٹ کا رکن اور سرد جنگ میں امریکہ کا سب سے قریبی حلیف بن گیا۔ امریکی جمہوریت کو جنرل ایوب کی فوجی آمریت میں کوئی خرابی نظر نہ آئی اور دونوں خوب شیر و شکر ہوئے۔ جنرل ایوب نے امریکی کانگریس سے خطاب کیا اور ابدی دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔

لیکن ۱۹۶۲ء کی پہلی آزمائش میں امریکہ پھر بھارت کی طرف لوٹ گیا' چین سے نام نہاد مقابلے کے لیے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو کیل کانٹے سے لیس کیا' اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنالوجی اور نیوکلیر ٹیکنالوجی سے نوازا اور پاکستان کو تقریباً زبردستی کشمیر میں اقدام کرنے سے روک دیا جس سے ایک تاریخی موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے تین سالہ امریکی فوجی اور معاشی امداد سے حاصل ہونے والی قوت کے زعم میں پاکستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے اپنے حلیف کا ساتھ دینے کی بجائے دونوں سے برابری (even handedness) کے نام پر پاکستان کی فوجی امداد روک دی حالانکہ بھارت کی فوجی سپلائی کا بڑا انحصار روس پر تھا' جب کہ پاکستان کا تقریباً مکمل انحصار امریکی اسلحہ کے نظام پر تھا۔ جنرل یحییٰ سے بھی

دوستی کی پینگیں بڑھتی رہیں اور کسنجر اور نکسن کے لیے چین تک رسائی کی خدمات انجام دینے والے پاکستان سے پھر ۱۹۷۱ء کے نازک لمحے میں جب بھارت نے دہشت گردی اور مکتی باہنی کی کھلی تائید کی اور پھر نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی، اسی طرح بے وفائی کی گئی جس طرح ۱۹۶۵ء میں کی گئی تھی۔ اب جو سرکاری دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان میں امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ کے وہ نوٹ موجود ہیں جو دونوں مواقع پر صدر امریکہ کو لکھے گئے اور دونوں میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ گو پاکستان سے ہماری دوستی اور معاہدات ہیں مگر ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیں۔

امریکہ کی مخالفت کا سب سے نمایاں اظہار ہماری نیوکلیر پالیسی کے سلسلے میں ہوا جس کے بارے میں امریکی خارجہ سیکرٹری ہنری کسنجر نے ان سارے احسانات کے باوجود جو چین سے روابط کے باب میں پاکستان نے خطرات مول لے کر کیا تھا اور جن کے باعث اسے ''وفادار دوست'' سمجھا جاتا تھا ایک ''عبرت ناک مثال'' (horrible example) بنانے کی دھمکی دی اور کارٹر نے قطع تعلق کر کے معاشی پابندیوں کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیا۔ یہ تو افغانستان پر روس کا حملہ اور اشتراکیت کی اس یورش کے خلاف افغان مجاہدین اور پاکستان کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان کی دوستی کی ضرورت پڑی لیکن جیسے ہی افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے، افغانستان اور پاکستان دونوں سے آنکھیں پھیر لی گئیں۔

یہ ضرور ہے کہ جزوی طور پر پاکستان کو فوج کی تنظیم نو، عسکری قوت کی ترتیب و تزئین اور معاشی میدان میں امریکہ سے اس دور میں کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ایسے فوائد ہم حاصل نہ کر سکے جن کا امکان اور موقع تھا مگر قیادت کی نااہلی، بدعنوانی اور خوشامدانہ ذہنیت کی وجہ سے انھیں حاصل نہ کیا جا سکا۔ لیکن اگر پورے دور کا میزانیہ مکمل معروضی انداز میں تیار کیا جائے تو چند نتائج سامنے آتے ہیں۔

امریکہ نے اس پورے دور میں ہمارے ساتھ، اور ہمارے ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا اور عالم اسلام کے جن جن ممالک کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا وہ خالص امریکی مفاد کی بنیاد پر تھا۔ گو اس پورے عرصے میں آزاد دنیا، جمہوری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا تذکرہ رہا اور نظریاتی اور اخلاقی اصولوں اور عالمی اقدار کی بات بھی بڑے بلند بانگ انداز میں کی گئی لیکن فی الحقیقت امریکی پالیسی کا ایک ہی مرکزی اصول ہے اور وہ امریکہ کا بحیثیت ایک عالمی قوت مفاد ہے۔ اس کی دوستی نہایت ناقابل اعتماد اور ناقابل بھروسہ ہے۔ اس کے لیے چشم زدن میں آنکھیں پھیر لینا ایک معمول ہے۔ یہ محض ہمارا تجربہ ہی نہیں، امریکہ کے اعلیٰ ترین پالیسی سازوں نے پوری میکیاولانہ چابک دستی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہی ان کی حقیقی پالیسی

ہے اور اگر اسے دوسرے نہیں سمجھتے تو یہ ان کی کور چشمی ہے' امریکہ کا دوغلا پن نہیں۔

امریکہ سے پاکستان کے جتنے بھی معاہدے ہوئے ہیں ان میں کبھی بھی امریکہ نے مصیبت کے وقت مدد کی قانونی اور دستوری ذمہ داری قبول نہیں کی۔ کئی امریکی صدور اور خارجہ امور اور دفاع کے سیکرٹریوں نے مدد کی زبانی یقین ہانی کرائی مگر اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔ جنرل ایوب نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو امریکی کانگرس کے مشترکہ اجلاس میں کہا تھا:

> وہ لوگ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے صرف پاکستان کے لوگ ہوں گے بشرطیکہ آپ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے جواب میں صدر کینیڈی نے کہا تھا:

> پاکستان فوری اور دیرپا ضرورت کے وقت کا دوست ہے۔ امریکی اپنی نجی اور عوامی زندگی میں دوستوں کی دوستی اور اس کی پایداری کی قدر کرتے ہیں۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں ہی اس کا پول کھل گیا اور پھر امریکی خارجہ سیکرٹری ڈین رسک نے یہ اصول بیان کر کے' پاکستان ہی نہیں' پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا:

> وعدے ہمیں کسی خاص اقدام کا پابند نہیں بناتے۔ زیادہ تر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جارحیت کی صورت میں ہم مشترک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دستوری طریق کار کے مطابق اقدام کریں گے۔ ہم دستوری تقاضوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس کا انحصار صورت حال کے حقائق پر ہو گا۔ بعض صورتیں دوسری کے مقابلے میں ہمارے کم اقدام کا تقاضا کرتی ہیں۔

۱۹۶۶ء میں سینیٹر سیمنگٹن نے وزارت خارجہ کو مجبور کیا کہ commitment کی وضاحت کریں تو محکمہ خارجہ کے ایک سینیر افسر نے اس میکاولین اصول کو بیان ہی کر دیا کہ:

> صدر آج ایک بیان دے سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اگلے دن اس سے دست بردار ہو جائیں۔ امریکہ پر صدر کے بیانات کی وجہ سے کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

پاک امریکی تعلقات کی پچاس سالہ داستان انھی کہہ مکرنیوں کی داستان ہے اور اس "اصول" کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے امریکی جمہوریت کے بانی جارج واشنگٹن نے بیان کیا تھا:

> ایک چھوٹی اور کمزور ریاست کا' ایک بڑی اور طاقت ور ریاست سے تعلق اول الذکر کے لیے آخر الذکر کا لاحقہ ہونا لازمی کر دیتا ہے۔ کسی قوم کا غیر متعلق لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ وہ اس حوالے سے اگر کچھ حاصل کرے تو اسے اپنی آزادی کے ایک حصے سے اس کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔

اقبال نے طاقت کی سیاست کے اس کھیل سے بروقت متنبہ کیا تھا' اگر ہم نے آنکھیں بند رکھیں تو

غلطی ہماری ہے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

امریکہ کی دوستی کا ایک اور لازمی نتیجہ سیاسی، معاشی اور خود عسکری میدان میں محتاجی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہم نے عالمی سیاست میں اپنی دوستیوں اور دشمنیوں کو بڑی حد تک امریکہ کے عالمی عزائم اور نظام کے تابع کرلیا اور ایک حقیقی طور پر آزاد اور ملت اسلامیہ کے مفاد کی محافظ خارجہ پالیسی وضع نہ کرسکے۔ معاشی میدان میں ہم بیرونی امداد اور قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے اور آج عالم یہ ہے کہ قرضوں کی غلامی نے ہماری آزادی کو پابند سلاسل کر دیا ہے اور ہماری پوری معیشت ملک کی حقیقی ضروریات اور قوم کی ترجیحات کے بجائے بیرونی ساہوکاروں کے اشارۂ چشم و ابرو کی تعمیل میں لگی ہوئی ہے۔ فوجی سروسامان اور جنگی آلات اور صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی ہمارا بڑا انحصار امریکہ پر ہوگیا ہے اور چونکہ وہ اپنے وعدوں کا پابند نہیں (حتیٰ کہ F-16 جن کی قیمت بھی ہم پیشگی ادا کرچکے ہیں، ان تک کو نہ ہم حاصل کرسکے اور نہ ان کی قیمت واپس لے سکے ہیں) اور جب چاہے اپنے مصالح کے تحت رسد کی راہیں مسدود کرسکتا ہے اس لیے ہماری دفاعی صلاحیت میں مسلسل کمی آرہی ہے۔

یہ دوستی ہمیں ہر میدان میں بحیثیت مجموعی بہت مہنگی پڑی۔ سارا الزام امریکہ کی مفاد پرستی اور دوغلے پن کو دینا انصاف کے خلاف ہوگا۔ اس نے اپنے قومی مفاد میں جو مناسب سمجھا، کیا لیکن اصل ذمہ داری ہماری اپنی قیادتوں کی ہے جن میں فوجی اور سول اور مسلم لیگ اور پیپلزپارٹی دونوں برابر کی شریک ہیں۔ اس پہلو سے ہمیں صدر کلنٹن کا ایک حد تک ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بڑی رعونت سے ہتک آمیز انداز میں پاکستانی قوم کی غیرت کو جگایا اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا ہے اور ہمیں فیصلہ کن موڑ کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ سارا کام پوری منصوبہ سازی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے سامنے اس ڈرامے کے تمام سین رکھے جائیں تاکہ محض دوستی اور بے وفائی کے تذکرے میں بات گم نہ ہو جائے۔

عالمی قوت کی حیثیت سے سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد امریکہ نے جس نئے عالمی نظام کا خاکہ تیار کیا ہے اس کے چار اہم ستون ہیں۔ ان چاروں کا اصل مقصد یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں جب تک ممکن ہو امریکہ کو واحد سوپر پاور کی حیثیت حاصل رہے اور کوئی متبادل قوت وجود میں نہ آنے پائے۔ اس

سلسلے میں جن مفکرین نے اس حکمت عملی کو فکری بنیادیں فراہم کی ہیں ان میں فرانسس فاکویاما کا اختتام تاریخ (The End of History) کا فلسفہ، سیمبویل ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilisations) کا نظریہ اور برزنسکی کی شطرنج کی عظیم بساط (The Grand Chessboard) خصوصیت کی حامل ہیں۔ اس فریم ورک میں دسیوں تحقیقی مقالات اور تھنک ٹینک کی رپورٹیں اور سیاست دانوں کی عملی کارروائیاں ہیں جن کے مطالعے اور تجزیے سے مستقبل کے نقشے کے دروبست صاف نظر آتے ہیں۔ یہ چار نکاتی فارمولا کچھ اس طرح ہے:

۱- عالم گیریت (Globalisation) جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں آزاد تجارت، سرمایہ کی آزاد حرکت اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ذریعے عالمی معیشت پر مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ کے تسلط کو دائمی شکل دی جائے۔ اس طرح دولت کی اس غیر مساویانہ تقسیم کو مستحکم کر لیا جائے جو سامراجی دور کی پیداوار ہے اور جس کے نتیجے میں مغربی اقوام (یورپ اور امریکہ) جو ۱۸۰۰ء میں عالمی پیداوار کا صرف ۲۷ فی صد پیدا کر رہی تھیں، ۱۹۱۸ء میں ان کا یہ حصہ بڑھ کر ۸۷ فی صد ہو گیا جبکہ ان کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا صرف ۱۸ فی صد ہے۔ اس نظام کو مستقل صورت اسی وقت دی جا سکتی ہے جب دنیا کے دوسرے ممالک اپنی معیشت کو خود انحصاری کی بنیاد پر ترقی نہ دے سکیں بلکہ اس عالمی نظام کا حصہ بن کر خام مال فراہم کرنے اور مصنوعات درآمد کرنے کا کام انجام دیں۔ اس طرح ترقی یافتہ ممالک کو نہ صرف یہ مسلسل بالادستی حاصل رہے بلکہ باقی دنیا ان کی محتاج رہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آزاد تجارت اور آزادی نقل و حرکت کے یہ علم بردار، انسانوں کی آزاد نقل و حرکت کے قائل نہیں ہیں اور انسانی آبادی کی حرکت (migration) پر کڑی پابندیاں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ مغربی اقوام کی بالادستی متاثر نہ ہو سکے۔ اگر آبادی کی کچھ حرکت ہو تو وہ بھی اس شکل میں کہ ترقی پذیر ممالک کے پڑھے لکھے اور دولت و ثروت کے مالک افراد مغربی ممالک میں داخل ہو سکیں اور مادی وسائل کے بہاؤ کے ساتھ اعلیٰ صلاحیت اور وسائل کا بہاؤ ہوتا رہے اور یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی تقویت کا ذریعہ بنتے رہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی معدنیات، توانائی کے سرچشموں خصوصیت سے تیل اور گیس پر مستقل قبضہ اور ان تک رسائی کے راستوں کی حفاظت کی جائے۔

۲- اس نظام کا دوسرا ستون سیاسی ہے یعنی انفرادی آزادی، جمہوریت، حقوق انسانی کا تحفظ اور مذہبی رواداری کی ترویج اور اس کے پردے میں ان ممالک میں ایسے نظاموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن کو سیاسی جوڑتوڑ، مالی وسائل، معاشی مراعات اور ذرائع معلومات کے توسط سے فکری کنٹرول اور تہذیبی غلبے کے ذریعے بہ آسانی متاثر کیا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کی جمہوریت کی تعبیر بڑی نرالی ہے۔ جمہوریت

کے معنی تمام انسانوں کی مساوات نہیں اور نہ لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے عقائد' اقدار اور ترجیحات کی روشنی میں اپنا نظام زندگی طے کریں۔ جمہوریت کی تعبیر یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کو اس طرح پروان چڑھایا جائے کہ یہ ممالک مغرب کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر ایسی قیادتیں مسلط رہیں جو مغربی تہذیب کی دلدادہ اور مغربی مفادات کی محافظ ہوں۔ نیٹو کو اب وسعت دے کر یورپ کی ان اقوام کو بھی اس کے چنگل میں پھانسا جا رہا ہے جو اپنا الگ تہذیبی وجود رکھتی ہیں اور کل کسی متبادل نظام کے لیے زمین فراہم کر سکتی ہیں۔ ترکی میں جمہوری تماشے کے باوجود پورا ملک سیکولر فوجی قیادت کی گرفت میں رہے' الجزائر میں عوام اپنی آزاد مرضی سے اگر اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں تو ان کی پوری قیادت کو پابند طوق و سلاسل کیا جائے' ملک میں سول وار کی کیفیت پیدا کر دی جائے اور یہ سب جمہوریت کے نام پر ہو۔ جمہوریت تہذیبوں اور نظام زندگی کے تعدد کا ذریعہ نہ بنے بلکہ جمہوریت کے عنوان سے مغربی سیاسی اور معاشی ادارے پوری دنیا پر مسلط کیے جائیں اور ان کے ذریعے وہاں کی آبادیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ جہاں کہیں حالات مغربی اقوام کی مرضی کے مطابق نہ ہوں وہاں انسانی بنیادوں پر مداخلت کے نام پر فوج کشی تک کا حق اپنے پاس محفوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی عالمی ادارے کی اجازت بھی ضروری نہیں بلکہ یہ سب امریکہ اور اس کے ہم نوا ممالک کے دائرہ اختیار میں رکھا جائے۔

جمہوریت کے یہ علم بردار کسی بالاتر قانون اور کسی غیر جانب دار اتھارٹی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اقوام متحدہ کو ایک غیر موثر ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے پاس کوئی اختیار نہیں اور سیکورٹی کونسل جسے کارروائی کا اختیار ہے اس میں پانچ طاقتوں کو ویٹو کا حق حاصل ہے اور اگر اس حق کی توسیع کی بات ہو رہی ہے تو وہ بھی کسی جمہوری اصول پر نہیں بلکہ اپنے ہی طائفے کے کچھ دوسرے ارکان کو مسلط کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک جو اہم عالمی مالیاتی ادارے ہیں ان میں بھی انھی مال دار ممالک کو اکثریت حاصل ہے اور ان کے اشارہ ابرو کے بغیر وہ ذرا بھی جنبش نہیں کر سکتے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کو اگر جمہوریت سے حقیقی دل چسپی ہوتی تو سب سے پہلے ان اداروں کو جمہوری رنگ میں رنگنے کی فکر کرتے لیکن اس کا دور دور پتا نہیں۔ عالمی میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذرائع پر مغربی اقوام کا کنٹرول بھی اس لبرل آرڈر کا حصہ ہے۔ اس طرح عالم گیریت اور جمہوری آزاد روی (democratic liberalisation) اس نئے نظام کے ایک دوسرے کو مضبوط کرنے والے دو جڑواں ستون (twin pillars) ہیں۔

۳۔ اس نظام کا تیسرا ستون ٹکنالوجی ہے' خصوصیت سے نیوکلیر اور ہائی ٹیک (Hi-tech) کمپیوٹر ٹکنالوجی پر مغربی اقوام کی اجارہ داری ہے۔ نئے دفاعی نظام کا بنیادی ستون امریکہ کی مستقل اور ناقابل چیلنج

عسکری قوت کا استحکام اور اسے جہاں سے بھی کوئی خطرہ ہو (خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو) اسے ختم کرنے کا حق ہے۔ سدجارحیت (deterrance) کے معنی اس نظام میں یہ ہیں کہ امریکہ اور اس کے حواریوں کی قوت اور بالادستی کو چیلنج کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایٹمی عدم پھیلاؤ کا مقصد دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کرنا نہیں' مغرب کی نیوکلیر بالادستی کو دائمی بنانا اور ہر چیلنج کا راستہ روکنا ہے۔ کیمیاوی اور گیس کے ہتھیاروں پر پابندی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اسی طرح میزائل کے نظام کو لگام دینے کا پروگرام بھی اس عسکری بالادستی کا تحفظ ہے۔

دہشت گردی (terrorism) کے باب میں جو محاذ کھولا گیا ہے اس کا مقصد بھی دنیا میں ابھرنے والی ہر متبادل قوت کو ایک قسم کے سوچے سمجھے تشدد کا نشانہ بنانا ہے جو خود انسانیت کے خلاف ایک سنگین جرم ہے۔ کوئی صحیح العقل انسان دہشت گردی اور تشدد کی حمایت نہیں کر سکتا لیکن مظلوم اگر ظالم کے خلاف ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جائے یا محکوم اقوام اپنی آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد کی راہیں مسدود ہونے کی صورت میں ظالم حکمرانوں کے مراکز قوت پر ضرب لگائیں تو اسے دہشت گردی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اگر یہ دہشت گردی ہے تو دنیا کے موجودہ سیاسی نقشے کا ۸۰ فی صد ایسی ہی جدوجہد کے نتیجے میں صورت پذیر ہوا ہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس کی سب سے قریبی مثال مشرقی تیمور ہے' جہاں ۲۰ سالہ عسکری جدوجہد کے بعد اقوام متحدہ کے زیرانتظام استصواب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مشرقی تیمور اپنے تیل کے ممکنہ ذخائر کی وجہ سے مغربی اقوام کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور ایک مسلمان ملک کو کمزور کر کے ایک عیسائی ریاست کا قیام اس کا نتیجہ ہے۔ لیکن بات اصول کی ہے اور جس حق کے تحت اقوام متحدہ کے ۱۳۰ ممالک آزاد ہوئے ہیں اسے محض اس لیے دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کشمیر' کوسووا' چیچنیا اور منڈاناؤ میں اس کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچے گا۔

۴- اس نظام کا چوتھا ستون نئی سیاسی حصار بندی ہے جسے بہت ہی ہوشیاری لیکن عیاری کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔ اس میں ناٹو کی توسیع' مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے قیام کے بعد اس کے معاشی غلبے کے لیے صلح کاری' وسط ایشیا میں ایک بار پھر روس اور مغرب سے منسلک ریاستوں کے مسلمان ریاستوں پر اثرانداز ہونے کے نظام کے دروبست' بھارت کو ایک ایشیائی قوت کے طور پر آگے لانے کی کوشش--- اس حصار بندی کا اصل ہدف اب چین اور عالم اسلام اور خصوصیت سے عالم اسلام کے وہ ممالک ہیں جو کچھ بھی آزاد روی اختیار کر سکتے ہیں اور جن میں اسلامی تحریکات ایک غالب قوت بن سکتی ہیں۔ اولیں ہدف چین کے ساتھ ایران' افغانستان اور پاکستان ہیں۔ ترکی کو یورپی یونین میں ضم کرنے اور ترک کردکش مکش کے ذریعے مستقل طور پر جنگ و جدال میں مصروف رکھنے کا پروگرام ہے۔ وسط ایشیا

کی اسلامی تحریکوں کو دہشت گردی کے نام پر قابو کرنے کا منصوبہ ہے۔ ایران اور افغانستان کو دبانے یا بدلنے کا ہدف ہے۔ پاکستان کو کمزور کرنے، چین کے ساتھ غلط فہمیاں پیدا کرنے اور اس کو ایران اور افغانستان کے قریب نہ ہونے دینے کی کوششیں ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان پر معاشی دباؤ کے ساتھ ساتھ اسے بھارت کی طرف سے عسکری خطرات سے بھی دوچار کرنا ہے۔ یہ اپنی روح اور مقاصد کے اعتبارات سے اسی طرح کا ایک حصار بندی کا نظام ہے جیسا سرد جنگ کے زمانے میں روس، چین اور مشرقی یورپ کے خلاف قائم کیا گیا تھا، گو نئے حالات کے پیش نظر اس کا اسلوب اور عنوانات مختلف ہیں۔ اس انتظام میں علاقے، ملک اور سیاسی ساتھیوں سب کے مقام اور تعلقات کی نوعیت میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں: "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!"

اس پس منظر میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان امریکہ کا فطری حلیف نہیں رہا اور بھارت اس کا "فطری حلیف" اور "اسٹرٹیجک پارٹنر" بن گیا ہے، خواہ بھارت میں حکومت اس پارٹی کے ہاتھوں میں ہو جو ہندو تشدد پرستی (Hindu Chanvinism) کی پرچارک، سیکولرازم کے مقابلے میں ہندووتا کی مبلغ، مسلمانوں، عیسائیوں اور تمام اقلیتی گروہوں کے خون کی دشمن اور ان کے تہذیبی قتل پر کاربند ہو۔ نیا نقشہ، نئی دوستیوں اور پرانے تعلقات پر نظرثانی کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین نے کہا ہے کہ عملی سیاست میں کوئی دوستی مستقل نہیں ہوتی، مستقل چیز تو صرف مفاد کا حصول ہے اور مفادات کی شکل اور نوعیت صحرا کی ریت کی حرکت کی طرح بدلتی رہتے۔ اسی روشنی میں دوستوں اور مخالفین کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ ہمیں امریکہ کی نئی ترجیحات اور نئی راہوں کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اپنے مقاصد اور مفادات کے تحفظ کے لیے کاربندی کی فکر کرنی چاہیے۔ محض پرانی دوستیوں کا گلہ، یا ان کے بحال ہو جانے کے خواب دیکھنا حقیقت پسندی کے خلاف ہے ؎

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو، غالب
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

بھارت کے لیے امریکہ کی مختلف حکومتوں میں، خصوصیت سے ڈیموکریٹ صدور اور پارٹی لیڈرشپ میں، ایک نرم گوشہ تو شروع ہی سے رہا ہے اور اس کے جغرافیائی محل وقوع، رقبے، آبادی، معاشی وسائل، مارکیٹ کی وسعت اور سیاسی اثرورسوخ کی وجہ سے اسے غیر فطری نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ جس طرح بھارت کی قیادت نے، نہرو دور ہی سے، خود کو سوشلسٹ نظام کا علم بردار، روس سے خصوصی تعلق اور غیر جانب تحریک کے رکن رکین کی حیثیت سے پیش کیا، اس نے سرد جنگ کے دور میں اسے امریکہ سے دور رکھا۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد حالات بدلے۔ بھارت نے بھی سوشلسٹ نظام کو (جیسا کچھ بھی وہ تھا) ختم کر کے منڈی کی معیشت کا راستہ اختیار کیا اور تجارت میں بھی نسبتاً آزاد روی کی پالیسی اختیار کی۔ افغانستان کے بارے میں روس کا ساتھ دینے کے باوجود اس نے آہستہ آہستہ امریکہ سے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ ۱۹۹۵ء تک ان روابط نے ایک واضح شکل اختیار کر لی جس میں معاشی تعاون، تجارت میں روز افزوں اضافہ، امریکی سرمایہ کاری میں اضافہ، سیاسی معاملات میں مفاہمت، عراق کے خلاف جنگ کے موقع پر امریکی ہوائی جہازوں کو تیل کی سہولت، اور بالآخر جنوری ۱۹۹۵ء میں امریکہ کے ڈیفنس سیکرٹری سے باقاعدہ معاہدے کے تحت بھارت اور امریکہ کے درمیان مشترک جنگی مشقوں کا آغاز ہوا۔

اس زمانے میں ایک اور اہم عنصر امریکہ میں بھارتی تاجروں، صنعت کاروں اور خصوصیت سے انفارمیشن ٹکنالوجی کے اداروں کا کردار ہے۔ امریکہ میں بھارتی نژاد لوگوں کی تعداد میں گذشتہ بیس سال میں چار لاکھ کا اضافہ ہوا ہے جو ۱۹۸۰ء کی تعداد پر ۶۶ فی صد اضافہ ہے۔ انڈین سوفٹ ویئر نے امریکی مارکیٹ میں اپنا مقام بنایا اور صرف یہ تجارت ۱۹۹۱ء میں ۴۵ ملین سے بڑھ کر ۱۹۹۹ء میں ۵ بلین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ اس وقت امریکہ کی سیلی کون ویلی میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار بھارتی سوفٹ ویئر انجینیئر کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے لیے بھارت کی کل برآمدات گذشتہ سال ۱۰ بلین ڈالر سے متجاوز ہو گئی ہیں جو بھارت کی کل برآمدات کا تقریباً ۲۲ فی صد ہے۔ اس طرح بھارت کی کل درآمدات کا تقریباً ۹ فی صد امریکہ سے آ رہا ہے۔ امریکہ سے بھارت کا توازن تجارت بھارت کے حق میں ہے (تقریباً ۶ بلین ڈالر سالانہ فاضل) اس لیے امریکہ کی مصنوعات کے لیے بھارت کی منڈیوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ بھارت میں امریکی سرمایہ کاری میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت بھارت میں کی جانے والی بیرونی سرمایہ کاری میں امریکہ کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی ہے اور تقریباً ساڑھے چار سو امریکی کارپوریشنیں بھارت میں مصروف سرمایہ کاری ہیں۔ پاکستان سے تقابلی صورت حال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بھارت کی امریکہ کو سالانہ برآمدات (۱۰ بلین ڈالر) پاکستان کی کل برآمدات (ساڑھے آٹھ بلین ڈالر) سے زیادہ ہیں اور بھارت میں کی جانے والی صرف امریکی سرمایہ کاری (۴۵۶ بلین روپے بھارتی) پاکستان کے کل سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔

بھارت نے صرف وزارت خارجہ اور واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے سفارت خانوں پر تکیہ نہیں کیا بلکہ بھارت نواز تنظیموں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ سو سو سے زیادہ امریکی ارکان کانگرس بھارتی لابی کا حصہ ہیں اور امریکہ میں بھارت نژاد ووٹر اپنے پیسے اور سیاسی اثر و رسوخ کو بڑے موثر انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا کردار اتنا اہم ہے کہ ایک مشہور بھارتی ماہر معاشیات پروفیسر جگدیش بھگوتی جو کولمبیا یونی ورسٹی میں پروفیسر ہے، کہتا ہے:

لیکن ہمارا رسوخ جس حقیقت کی بنیاد پر ہے وہ یہ ہے کہ بھارتی کیونٹی میرے کہنے کے مطابق امریکہ کے "اگلے یہودی" (next jews) ہیں۔ بہت زیادہ کامیاب' علمی طور پر بلند' معاشی طور پر نمایاں' ان افراد کو وہ تمام networking فوائد حاصل ہیں جو میرٹ پر مبنی انفارمیشن کا رجحان رکھنے والا معاشرہ جیساکہ امریکہ ہے' دے سکتا ہے۔ ہمارا اثرورسوخ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمارے نمایاں دانش ور' آرٹسٹ' سائنس دان' پالیسی ماہرین اور تحقیق کار بارسوخ امریکیوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ میڈیا میں ہمارے مضامین بھی اس رسوخ کی وجہ ہیں۔ ایک ایسے سیاسی نظام میں جو نقد عطیات پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہو' ہمارا سیاسی اثرورسوخ اس لیے بھی برابر بڑھ رہا ہے کہ ہمارے تاجر خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی میں ان نئے ارب پتیوں میں ہیں جن کو جناب کلنٹن' گور' اور بش محض لالچ کی وجہ سے نہایت احترام سے دیکھتے ہیں (The Next Jews' انڈیا ٹوڈے' اپریل ۲۰۰۰ء)۔

بھارت نے اپنا ہوم ورک بڑی ہوشیاری' مہارت اور چابک دستی سے کیا ہے۔ جسونت سنگھ اور ٹالبوٹ کی دس ملاقاتوں نے امریکہ کے پالیسی سازوں کی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ جسونت سنگھ کی کتاب Defending India جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ہے' اس میں غیرجانب دار تحریک پر سخت تنقید کی گئی ہے اور اس پالیسی کے ۵۰ سالوں کو گم شدہ سال (lost year) قرار دیا گیا ہے اور امریکہ سے دوستی ہی نہیں معلوماتی اور اداراتی تعلق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ دستاویز بصیرت (document on vision) کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے بھارت اور امریکہ ویسے ہی رشتہ تحالف میں جڑ گئے ہیں جیسا بھارت نے مشرقی پاکستان پر یورش سے پہلے روس سے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔

کلنٹن کے دورے سے پہلے خارجہ سیکرٹری میڈلین البرائٹ نے ایک بڑا اہم بیان دیا جس میں کہا کہ ہم بھارت سے ماضی کے پچاس سالوں میں بے توجہی کے لیے معذرت کرتے ہیں اور کارل انڈرفرتھ نے صاف لفظوں میں یہ تک کہہ دیا کہ:

بھارت سے ہمارے مجموعی تعلقات کسی دوسرے ملک سے ہمارے تعلقات کے یرغمال نہیں ہوں گے۔

امریکہ کے چوٹی کے اکیس دانش وروں نے ایک ٹاسک فورس کی طرف سے' جس کی سربراہی مشہور بروکنگز انسٹی ٹیوشن کے نائب صدر اس کے فارن پالیسی اسٹڈیز کے ڈائرکٹر رچرڈ ہاس (Richard N. Haass) نے کی' ایک رپورٹ تیار کی جس میں کلنٹن کو مشورہ دیا گیا کہ سرد جنگ کے بعد دنیا میں بھارت کے کردار کو مرکزی اہمیت دی جائے اور پاک بھارت تنازع اور نیوکلیر معاملات کو اس نئے تعلق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر کو پس پشت ڈالا جائے اور دہشت گردی اور اسلامی تشدد پسندی کے

خطرات کو اہمیت دی جائے۔ اس ٹاسک فورس نے یہ تجویز بھی دی تھی کہ پاکستانی عوام سے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے براہ راست خطاب کیا جائے۔

صدر کلنٹن کے وفد میں ایک بڑی تعداد امریکی تاجروں، صنعت کاروں، سرمایہ کاروں اور بھارت نژاد امریکی پروفیشنل افراد کی تھی۔ اس ساری کوشش کا ہدف بھارت اور امریکہ کو ایک نئے تحالف میں باندھنا اور مستقبل کے تعاون اور فیصلہ سازی کے لیے تعاون اور مکالمے کا ایک نظام بنانا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاکستان اور ان ایشوز کو پس پشت ڈالا جائے جو پاکستان کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ جس کے بارے میں صدر کلنٹن نے اپنے پہلے جنرل اسمبلی کے خطاب میں تشویش کا اظہار کیا تھا، ۴ جولائی کے اعلانیہ میں "ذاتی دل چسپی" کا وعدہ کیا تھا اور ایک روایت ہے کہ اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ اپنی صدارت کے دور کے ختم ہونے سے پہلے کشمیر کے مسئلے کا حل تلاش کر لوں گا، اس دورے میں اور اس کے بعد ایک ضمنی اور صرف دو طرفہ معاملہ رہ گیا ہے۔ اصل مرکزی مسئلہ دہشت پسندی بن گیا اور وہ بھی پاکستان کی دراندازیوں کی پیداوار کی حیثیت سے۔ چشم زدن میں صدر کلنٹن اور ان کی ٹیم کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو بھی بھول گئے جن کا ذکر خود ان کی تقریروں، خطوط اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر میں جنگ بندی کے وقت بھارت کی فوج کی تعداد ۱۲ ہزار تھی جسے مزید کم کرنے کی بات کی گئی تھی۔ آج وہ ۷ لاکھ سے زیادہ ہے جو بھارت کی کل بری فوج کے نصف کے برابر ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں ۷۰ ہزار کشمیری جوان، بوڑھے اور بچے شہید کیے جا چکے ہیں لیکن اس ریاستی دہشت گردی کی کوئی خلش بھی اس دوسرے دور کے بیانات میں نظر نہیں آتی۔

دستاویز بصیرت سے لے کر صدر کلنٹن اور ان کے رفقا کی تقاریر کا تجزیہ کیجیے، صاف نظر آتا ہے کہ ڈپلومیسی کی زبان میں وہ اسی کے لگ بھگ بات کہہ رہے ہیں جو بھارت کہہ رہا ہے اور ان سے کہلوانا چاہتا ہے۔ بھارت کی جمہوریت کے قصیدے گائے جا رہے ہیں اور بھارت میں اقلیتوں پر جو ظلم و ستم جاری ہے اس کا کوئی احساس موجود نہیں۔ بھارت میں اس وقت سترہ آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن کلنٹن صاحب کو وہاں نسلی، لسانی اور مذہبی رواداری اور ہم آہنگی ہی نظر آتی ہے۔ اور دبے لفظوں میں اور بڑی چابک دستی کے ساتھ خود نیوکلیر پالیسی میں بھی تبدیلی کے بیج رکھوائے گئے ہیں۔ بھارت نیوکلیر اسلحہ سے دنیا کو پاک کرنے کے موقف سے ہٹ کر صرف "عدم پھیلاؤ" کی طرف آگیا ہے جبکہ امریکہ نے بھارت کے سیکورٹی خدشات کو بالواسطہ تسلیم کر لیا ہے اور اسے علاقے ہی میں نہیں عالمی سطح پر قیادت کی اشیرباد دے دی ہے۔ دستاویز بصیرت میں یہ "بصیرت افروز" اعلان موجود ہے کہ:

آیندہ صدی میں بھارت اور امریکہ علاقائی اور بین الاقوامی سلامتی یقینی بنانے کے لیے باہم ذمہ

داری اور مشترک مفاد کی خاطر امن کے لیے ساتھی ہوں گے (partners in peace)۔ ہم ایشیا اور اس سے ماورا اسٹرٹیجک استحکام کے لیے مل جل کر کام کریں گے اور باقاعدہ مشاورت جاری رکھیں گے۔ ہم علاقائی امن کو درپیش چیلنج اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترک کوششوں میں اضافہ کریں گے۔

میڈم البرائٹ نے دورے کے بعد اپنے ایک مضمون میں جو امریکی اخبارات میں ۴ اپریل کو شائع ہوا ہے' فرمایا ہے:

بھارت میں جمہوری ادارے زندگی سے بھرپور ہیں' بنگلہ دیش میں نشوونما پا رہے ہیں اور پاکستان میں خطرے سے دوچار ہیں--- صدر کلنٹن کے بھارت کے دورے کا بنیادی مقصد بھارت کے ساتھ جوہری دھماکوں سے پہلے کی صورت حال کی طرف پلٹنا نہیں بلکہ بہتر اور کارآمد تعلقات کی راہ ہموار کرنا تھا۔

اکانومسٹ نے اس دورے کے نتیجے کے طور پر بھارت اور امریکہ میں ہم آہنگی اور پاکستان کے لیے اس کے مضمرات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

صدر کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے چھ روزہ دورے کے دوران جو بیشتر بھارت کا تھا امریکہ نے علاقے کے سب سے بڑے تنازعے کے بارے میں بھارت کے نقطہ نظر کا اتنا ساتھ دیا جتنا اس سے پہلے کبھی نہ دیا تھا۔ جناب کلنٹن نے صاف صاف کہا کہ بھارت سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کشمیر میں تشدد کی کارروائیاں ختم ہونے سے پہلے پاکستان سے مذاکرات کرے۔ انھوں نے قریب قریب اس بات کو تسلیم کیا کہ چونکہ بھارت اپنے حصے کے کشمیر سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا' اس لیے لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد ہو جانا چاہیے۔ یہ ایسا حل ہے جو بیشتر بھارتی لیکن ابھی تک بہت کم پاکستانی تسلیم کریں گے۔ کچھ پنڈتوں کا دعویٰ ہے کہ امریکہ کی پالیسی میں یہ تبدیلی بھارت کو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گذشتہ بہار میں پاکستانی مداخلت کا انتقام لینے پر اکسائے گی (اکانومسٹ' یکم اپریل ۲۰۰۰ء)۔

بلاشبہ بھارت میں اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ ایشین ایج نے لکھا ہے:

وہ سب کہتے ہیں کہ اس کے دورے نے امریکہ کی دوستی کا توازن پاکستان سے ہٹا کر بھارت کی طرف جھکا دیا ہے۔ (۶ اپریل ۲۰۰۰ء)۔

اگر پاکستان کی قیادت اور قوم ان جوہری تبدیلیوں کو نظرانداز کرتی ہے اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی اور موثر حکمت عملی تیار نہیں کرتی تو یہ زندگی اور ترقی کا نہیں' قومی خودکشی کا راستہ ہو گا۔ صدر کلنٹن نے امریکہ کی ترجیحات' دل چسپیوں' مفادات اور منصوبوں سے مطلع کرنے میں کوئی کسر نہیں

چھوڑی ہے۔ جس انداز میں وہ پاکستان کی سرزمین پر نازل ہوئے وہ کسی جاسوسی ناول کا منظر پیش کرتا ہے۔ تقریر اور گفت و شنید کے لیے جو زبان، طریقہ اور انداز اختیار کیا اس سے کوئی پردہ نہیں رہا۔ تصویر کشی کے لیے بھی احکام تھے کہ صدر اور چیف ایگزیکٹو کے مصافحہ اور ملاقات کی کوئی شبیہ بھی دنیا کے سامنے نہ آنے پائے۔ جمہوریت کے علم بردار جس طرح جمہور سے دور رہے اور صرف سرزنش اور دھمکیوں کو تکیہ کلام بنایا اس پر تو بجاطور پر ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر بھی یہ سوال زیر بحث آ رہا ہے کہ کیا فی الحقیقت اس منظر کی خاطر دورے کا اہتمام کرایا گیا تھا؟ (ملاحظہ ہو ڈان میں ایم ضیاء الدین کا کالم 'The Clinton Visit' مسعود حیدر کا نیویارک سے مضمون 'The Fall out of Clinton Visit' (۲۱ مارچ)' اور شاہین صہبائی کا واشنگٹن سے مضمون Who Pushed me in the Pool? (۳۰ مارچ)۔ غالب پر بھی شاید کوئی ایسی ہی قیامت ٹوٹی ہو گی جو وہ پکار اٹھا ؎

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

جو سوال اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ ان حالات میں پاکستان کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور وہ کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرے۔ دکھ، افسوس، ندامت، غصہ--- سب بجا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی حالات کا مداوا نہیں کر سکتی۔ ہمارا ردعمل جذباتی اور وقتی حالات کے دباؤ میں نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طبقہ لچک کی باتیں کر رہا ہے اور حقیقت پسندی کے نام پر امریکہ کے نشان زدہ راستے پر کچھ تحفظات اور ظاہری لیپاپوتی کے ساتھ چلنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اس کے لیے حالات کی ناسازگاری، معیشت کی زبوں حالی اور عالمی فضا کی دہائی دے رہا ہے۔ ترکی اور ملایشیا جیسے دوست ممالک کی سرد مہری سے بھی خوف دلایا جا رہا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی نگاہوں کی بھی بات کی جا رہی ہے۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں، جہاد کشمیر میں نرمی، دینی مدارس پر گرفت اور افغانستان سے کشیدگی کے مشورے بھی دیے جا رہے ہیں۔ ٹریک ٹو ڈپلومیسی کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے اور امریکہ کی carrot and stick پالیسی سے خوف اور طمع دونوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ آوازیں اور سرگوشیاں ایک محدود طبقے کی طرف سے ہو رہی ہیں جب کہ قوم کی اکثریت دکھ اور صدمے کے ابتدائی احساس کے بعد بالکل ایک نئے اقدام (initiative) کی متمنی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ قوم کسی امریکہ مخالف جذباتیت (anti America emotionalism) کا شکار ہوئے بغیر پورے عزم اور احترام سے امریکہ کو یہ پیغام دے دے کہ دوستی اور تعاون کا راستہ کھلا ہوا ہے لیکن محکومی اور تابعداری کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ کو حق ہے کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر جو

روش چاہے اختیار کرے لیکن ایک نسبتاً چھوٹے ملک ہونے کے باوجود پاکستان اور اس کے عوام بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی آزادی' سلامتی اور قومی مفادات کی روشنی میں اپنا موقف طے کریں۔

آج پاکستانی قوم جوہری اعتبار سے کچھ ویسے ہی حالات سے دوچار ہے جو ملت اسلامیہ پاک و ہند کو ساٹھ سال پہلے برطانوی دور میں درپیش تھے۔ برطانوی حکومت' انڈین نیشنل کانگرس اور ہندواکثریت جمہوریت اور عالمی رائے کے نام پر مسلمانوں کے نظریاتی اور سیاسی تشخص کو نظرانداز کر کے انھیں ایک ایسے سیاسی نظام کے شکنجے میں کسنا چاہتی تھی جس میں ان کے لیے دائمی محکومی اور محرومی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمان کمزور تھے' غیر منظم تھے' معاشی اعتبار سے پیچھے تھے اور کانگرس نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ ہندستان میں دو ہی قوتیں ہیں: انگریز اور کانگرس--- ان دونوں کو مستقبل کے فیصلے کا حق ہے۔ قائداعظم اور مسلمانان پاک و ہند نے اس اعلان کو چیلنج کیا اور کہا کہ ایک تیسری قوت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان' جن کا اپنا قومی تشخص ہے--- اور ان کے فیصلے میں شریک ہوئے بغیر اور ان کی رضامندی کے بغیر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں بن سکتا۔ انگریز اور ہندو دونوں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی آواز بے وقت کی راگنی ہے۔ مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تصورات میں مذہب کی بنیاد پر قومیت ایک عجوبہ ہے۔ نیشنلزم اور جمہوریت ہی وقت کے غالب نظریات ہیں اور مسلمان سیاسی طور پر کمزور اور معاشی اعتبار سے غیر موثر ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے عزم اور قربانی' قائداعظم کی بالغ نظر قیادت اور نظریہ پاکستان کی دل کشی اور تسخیری قوت نے سات سال میں حالات کا نقشہ بدل دیا اور جو بظاہر ناممکن تھا وہ ایک زندہ حقیقت بن گیا۔

آج بھی ہم ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں انگریز کی اس تہذیبی ذریت نے جو آزادی کے بعد اقتدار پر قابض رہی ہے' تحریک پاکستان کی کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ قائداعظم کے پاکستان کو دولخت کیا اور جو قوم انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے آزاد ہوئی تھی' اسے بڑی چابک دستی سے امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ آج صدر کلنٹن ہمیں پھر بھارت کی بالادستی کے تحت چین کی زندگی اور معاشی ترقی کے سراب دکھانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

اور "کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی" --- اس قوم کے جوہر آزمایش ہی میں کھلتے ہیں اور آج ہم ایک ایسی ہی آزمایش سے دوچار ہیں۔

زمانے کے ساتھ چلنے' اور مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر پلٹ جانے کا مشورہ دینے والے دراصل ہمیں غلامی اور محکومی کی طرف لے جا رہے ہیں اور ہمیں حسن ظن ہے کہ غالباً غیر شعوری طور پر فرار کی اس راہ میں زندگی کا پرتو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عزت اور ترقی کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ اپنی

اصل منزل، اپنے مقصد وجود، اپنی آزادی اور نظریاتی تشخص کے بارے میں کسی سمجھوتے اور نام نہاد لچک کے جال سے بچنا، زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کر کے محنت، جدوجہد اور قربانی کے ذریعے اپنے مطلوب کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جانا ہے: اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

امت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن نے کی ہے اور اس کا پیغام یہی ہے کہ

> جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھ ہیں اور آخرت میں بھی" (حم السجدہ ۴۱:۳۰-۳۱)۔

مشکل وقت میں صبر اور مقابلہ کا حکم دیا گیا:

> اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے (آل عمران ۳:۲۰۰)۔

بلاشبہ ہمیں ہر معاملہ میں اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ ہم حق پر ہیں لیکن حق کے باب میں کمزوری اور سمجھوتے کا راستہ اختیار کرنا، یہ اہل ایمان کی روش نہیں۔ جس کی بہترین مثال خود اسوہ نبویؐ میں ملتی ہے کہ جب قریش کے دباؤ میں خود ان کے عم محترم نے سمجھوتے اور لچک کی بات کی تو آپؐ نے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ لوگ میرے سیدھے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں حق کی دعوت پہنچانے سے باز نہیں آؤں گا حتیٰ کہ یہ دعوت کامیاب ہو جائے یا میں اس میں کام آجاؤں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

اقبال نے بھی اسی اسوہ نبویؐ کی روشنی میں زمانے کے ساتھ چلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی تلقین کی تھی۔

حدیث بے خبران است کہ بازمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

ضرب کلیم کے سارے پیغام کا خلاصہ ہی یہ ہے کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

خون دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ!

اور یہی وہ عزم اور رہنمائی تھی جو قائداعظم نے اس قوم کو دی اور اسے کش مکش اور پیکار کے ذریعے آزادی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا:

"آبرو مندانہ تصفیہ صرف برابری رکھنے والے فریقین کے مابین ہو سکتا ہے۔ جب تک دونوں فریق ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے سے خوف زدہ ہونا نہیں سیکھتے' اس وقت تک ان کے درمیان کسی تصفیے کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہوتی۔

کمزور جماعت کی جانب سے امن کی پیش کش کا ہمیشہ مطلب اپنی کمزوری کا اعتراف اور جارحیت کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ (اندریں حالات) حب الوطنی' انصاف' ایمان داری اور خیرسگالی کی اپیلیں رائیگاں ہوں گی (تقریر' اکتوبر ۱۹۳۷ء Speeches and Writings' جلد ا' ص ۳۲)۔

یہ وہی حکمت عملی ہے جسے قرآن نے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّاللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال ۸: ۶۰) اور تم لوگ' جہاں تک تمھارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے "ن کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے ،مدا کو خوف زدہ کردو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت خدا پر بھروسہ' اپنے مقاصد اور اہداف کی حقانیت پر یقین' اپنے موقف پر استقامت اور نفس پرستی اور ذاتی مصالح سے بالا ہو کر اس قوم کی آزادی' سلامتی' عزت اور ترقی کے لیے ڈٹ جانے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور جدوجہد ہے ؎

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اس حکمت عملی کی صحت' صداقت اور افادیت کے بارے میں تو دو رائے ممکن نہیں' البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں پورا کیے بغیر یہ موثر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے دوسروں کی طرف نگاہیں لگانے اور دست سوال دراز کرنے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسہ' اپنے اللہ پر بھروسہ اور اپنی قوم پر بھروسہ ضروری ہے۔ اس کے لیے قوم پر اعتماد' اس کو اصل حالات سے آگاہ کر کے جدوجہد پر آمادہ کرنا اور قیادت کی وہ مثال پیش کرنا ضروری ہے جس کا نمونہ ہمارے آقا اور قائد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا کہ آزمایش کی گھڑی میں اگر عام مسلمانوں کے پیٹ پر ایک پتھر ہوتا تو حضورؐ کے

پیٹ پر دو پتھر تھے!

اندرونی یک جہتی، اور باہمی آویزشوں اور وقتی اور گروہی مصالح سے بالاتر ہو کر پوری قوم کو خود انحصاری کے حصول اور ایسی معاشی اور عسکری قوت کی تشکیل و تعمیر کے لیے سرگرم کرنا ہے جو دشمن پر ہماری ہیبت طاری کر سکے۔ ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور ترقی اس کا ایک پہلو ہے لیکن اس کے ساتھ معاشرتی، ملی یک جہتی، فکری قیادت، تعلیم و تحقیق کے میدان میں اپنا لوہا منوانا بھی ضروری ہے۔ قوم میں حقیقی اسلامی جہاد کی روح اور اجتماعی زندگی میں انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم اس کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ آج نفرتوں کی جس آگ میں ہم جھلس رہے ہیں اور غربت اور معاشی فساد کے جس جہنم میں آبادی کا بڑا حصہ مبتلا ہے، اس سے نجات ہی ہمیں آزادی اور قومی سلامتی کی حفاظت کے لائق بنا سکتی ہے۔ جمہوری اداروں کا احیا اور قوم کی معتمد علیہ قیادت کا زمام کار کو سنبھالنا اس عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

آج بھی اس عزم، اسی بالغ نظری اور اسی بے لوث جدوجہد کی ضرورت ہے جو ملت اسلامیہ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں ساٹھ سال پہلے کی تھی۔ ان حالات میں فطری طور پر قوم کی نظریں تحریک اسلامی اور ان تمام محب وطن افراد اور قوتوں کی طرف اٹھتی ہیں جن کا دامن ماضی میں کیے جانے والے استحصال، بدعنوانیوں اور بے وفائیوں سے پاک ہے۔ قوم میں آج بھی جان ہے اور ایسے عناصر کی کمی نہیں جو صحیح قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔ آزمائے ہوئے انسانوں اور کھوٹے سکوں سے نجات اور نئی، پرعزم، ایمان دار اور باصلاحیت قیادت کو بروئے کار لانا وقت کی اہم ضرورت ہے جو مجوزہ حکمت عملی کی کامیابی کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ فوجی قیادت اور اس کی سول ٹیم کی اب تک کی کارکردگی سخت غیر تسلی بخش ہے لیکن صدر کلنٹن کے حالیہ دورے اور امریکہ کی سیاست کے نئے رخ نے ایک تاریخی موقع دیا ہے جس سے کسی تاخیر کے بغیر فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے قوم میں اتفاق و اتحاد، تمام اہم عناصر کا ایک مقصد کے لیے تحرک، اور قوم اور فوج میں تعاون، ایک حقیقی طور پر نمایندہ جمہوری نظام کا قیام، اور دفاع اور قومی تعمیر نو دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنے والی قیادت کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کا تقاضا اور درپیش چیلنج کا جواب ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

نیکی کرنا چاہیں تو ہزار راستے اور ہزار طریقے ہیں'
نیکی کیجیے' چلتے پھرتے' ملتے جلتے' اٹھتے بیٹھتے'
---کوئی آپ کے ساتھ نیکی کرے تو
اس کا شکریہ ادا کیجیے' دل میں محسوس کیجیے
یہ بھی نیکی ہے!

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:
جو بندوں کا شکر نہیں کرتا' اللہ کا شکر کیا کرے گا!

شکریہ ادا کرنا' صرف رسم اور ایٹی کیٹ نہیں
زندگی کا ایک رویہ ہے
اللہ کا شکر---زبان سے' دل سے' عمل سے'
اللہ کے انعامات اور احسانات کا سوچیں--- تو
کتنا ہی شکر کریں' حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہوتا!

دن گزار کر سوچیے--- کن کن لوگوں نے
آپ کے ساتھ' نیکی کی' بھلائی کی' کوئی فائدہ پہنچایا'
سب کے لیے دل میں شکریے کے جذبات ہوں
اور پیدا کرنے والے رب کے لیے بھی!
اے اللہ' تیرا شکر ہے---!!

(خیر خواہ)

کلام نبویؐ کی کرنیں

مولانا عبدالمالک

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہمارے بلند و بالا پروردگار دو آدمیوں پر تعجب فرماتے ہیں۔ ایک اس پر جو اپنے گھر میں نرم و گرم بستر پر پرسکون نیند میں ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے تو وہ میری نعمتوں کے شوق اور عذاب کے ڈر سے اہل و عیال اور آرام دہ بستر سے اٹھ کر نماز کی خاطر مسجد جاتا ہے۔ دوسرا وہ جو ایک محاذ پر فی سبیل اللہ لڑائی لڑ رہا تھا کہ لوگ شکست کھا کر بھاگنے لگے، اس شخص نے بھاگنے کے گناہ اور مورچوں میں واپسی کے ثواب کو دیکھا اور میری نعمتوں کے حصول اور میری پکڑ سے ڈر کر واپس لوٹ آیا۔ لڑا، حتیٰ کہ اس کا خون گرا دیا گیا اور وہ جام شہادت نوش کر گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں: ذرا اس کی طرف توجہ کرو، یہ میری نعمتوں کے شوق اور میری پکڑ کے ڈر سے واپس لوٹ آیا اور لڑتا رہا یہاں تک کہ جام شہادت نوش کر لیا (الفتح الربانی، ترتیب مسند احمد شیبانی)۔

کتنی اونچی شان ہے ان کی جن کی شان پر خود اللہ تعالیٰ اظہار تعجب فرماتے ہیں۔ اس کرہ ارض پر چلنے پھرنے والے اربوں انسانوں میں سے ایسے کتنے خوش نصیب ہیں جن کی عظمت و رفعت اور خوش قسمتی پر اللہ تعالیٰ حیرت فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا تعجب اور حیرت کسی چیز کے غیر معمولی ہونے کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا کیا ٹھکانا۔ نماز باجماعت کے لیے آرام دہ، نرم و گرم اور لذت آفریں بستر کو چھوڑنا کتنا مشکل ہے؟ نیند پوری ہو گئی، پھر کیوں اٹھنے کی ہمت نہیں ہے۔ جنت کا شوق اور دوزخ کا ڈر دامن گیر ہو تو پھر کوئی مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یہ نماز مشکل ہے مگر ان لوگوں پر جو ڈرنے والے ہیں، جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ سے ملنے والے اور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں" (البقرہ ۲: ۴۵-۴۶)۔

میدان جہاد میں لڑائی جاری ہو، اور سب آگے بڑھ بڑھ کر شہید ہو رہے ہوں، اس سے مختلف صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی مرحلے پر آس پاس کے لوگ پیٹھ پھیر جائیں، اس وقت ایک مومن قدم پیچھے ہٹالے، لیکن پھر اجر کی توقع اور عذاب کے ڈر سے واپس معرکے میں آ شامل ہو اور شہادت کا جام نوش کر لے۔ ایسے شخص کے لیے

اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام ہے، فرشتوں سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یقیناً جب عام چلن، دین پر چلنے کا نہ ہو، احکامات سے پیٹھ پھیرنے کا ہو، ان حالات میں دین کے راستے پر ثابت قدمی سے چلنا بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاص حیثیت رکھے گا۔

○

حضرت مخارق بن عبداللہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ایک آدمی آتا ہے اور میرا مال اٹھا کر لے جاتا ہے تو میں اسے کس طرح منع کروں؟ آپؐ نے فرمایا: اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر نصیحت کرو۔ اس نے عرض کیا: اگر وہ نصیحت کی طرف توجہ نہ دے تو پھر کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: تمہارے اردگرد جو مسلمان ہوں ان سے مدد حاصل کرو۔ اس نے عرض کیا: اگر میرے اردگرد مسلمان نہ ہوں، تو پھر کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: پھر حکمران سے مدد حاصل کرو۔ اس نے عرض کیا: اگر حکمران بھی دور ہو، تو؟ آپؐ نے فرمایا: اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑائی لڑو، قتل ہو گئے تو آخرت میں شہدا کی صف میں شامل ہو جاؤ گے اور زندہ رہ گئے تو پھر اپنے مال کی حفاظت کر لو گے (نسائی)۔

معاشرے میں ظلم اور حق غصب کرنے کے خلاف نصیحت بے اثر ہو، حکومت بھی غافل ہو تو فرد کی جانب سے مزاحمت کا یقین ہی ظالم و غاصب کو شکست دے سکتا ہے۔ ظلم کو برداشت کرنا، ظالم کو تقویت دیتا ہے۔ مظلوموں کو منظم کر کے کھڑا کرنا اسلام کا تقاضا ہے۔ مظلوم کو تنہا نہ چھوڑا جائے، اس کا ساتھ دیا جائے۔ مظلوم بھی ظلم سہنے کے بجائے، مقابلہ کرے، وہ یہ جانتا ہو کہ جان گئی تو شہادت حاصل ہوگی۔ مزاحمت پر آمادگی، اور اس کے لیے تیاری معروف ہو تو لوٹ مار کی نوبت کم آئے گی۔

○

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے گھر سے نکلا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپؐ نماز پڑھا رہے تھے۔ میں بھی آخری صف میں کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کے ساتھ میں نے بھی نماز پڑھی۔ میں آخری صف میں تھا کہ نبیؐ نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ مصلے سے اٹھ کر سیدھے آخری صف میں میرے پاس تشریف لائے۔ پوچھا: کیا کام ہے؟ میں نے عرض کیا: اسلام قبول کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ آپؐ فرمایا: یہ تو تمہارے لیے بہت اچھا ہوگا۔ آپؐ نے پوچھا: کیسی ہجرت کرو گے، دیہاتی ہجرت یا باتی (مستقل) ہجرت؟ میں نے پوچھا: کون سی ہجرت زیادہ بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: باتی ہجرت بہتر ہے۔ پھر آپؐ نے باتی ہجرت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ باتی ہجرت یہ ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے ساتھ مستقل قیام کر لو، اور دیہاتی ہجرت یہ ہے کہ اپنے گاؤں واپس چلے جاؤ (اور بلاوے پر آجایا کرو)۔ آپؐ نے فرمایا کہ تنگی اور آسانی، پسند و ناپسند اور دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں اطاعت کرنا ہوگی۔ میں نے عرض کیا: تیار ہوں! اس کے بعد آپؐ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، میں نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ آپؐ نے دیکھا کہ میں کسی قسم کے استثنا اور قید کے بغیر بیعت کے لیے تیار ہوں تو آپؐ نے شفقت فرماتے ہوئے اطاعت کے ساتھ استطاعت کا اضافہ فرما دیا اور فرمایا: اپنی استطاعت کی حد تک ہر حالت میں اطاعت کرو گے۔ یہ فرمانے کے بعد اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا اور بیعت لے لی (کنزالعمال)۔

آپؐ کا طریقہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں آنے والے تمام نمازیوں پر نظر رکھتے، اور نئے اور پرانوں میں امتیاز کرتے۔ آپؐ نے حضرت واثلہ بن اسقعؓ کو دیکھا تو ان کے پاس چلے گئے۔ یہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ کی ایک مثال ہے۔

ہجرت کی دو قسمیں ہیں: "دیہاتی ہجرت" اور "باقی ہجرت"۔ آس پاس کے لوگ کچھ دن قیام کریں، اس کے بعد واپس جا کر اپنے دیہات کے لوگوں کو تعلیم دیں، یہ "دیہاتی ہجرت" تھی۔ دور دراز کے لوگوں کے لیے "باقی ہجرت" تھی یعنی مدینہ میں مستقلاً رہ کر علم بھی حاصل کریں اور جہاد میں بھی حصہ لیں۔ حضرت واثلہ بن اسقعؓ قریبی علاقے سے آئے تھے۔ ان کے لیے دونوں طرح کی ہجرت کی اجازت تھی۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ہجرت کے متعلق سوال کیا۔ انھوں نے اس ہجرت کو اختیار کیا جو عارضی نہ ہو بلکہ مستقل ہو، اس لیے کہ یہ افضل تھی۔

○

حضرت معدان بن ابی طلحہؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابوالدرداؓ نے پوچھا: آپ کی رہائش کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: حمص کے قریب ایک بستی میں۔ اس کے بعد حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی بستی جس میں تین آدمی اس حال میں رہتے ہوں کہ وہاں اذان اور نماز باجماعت نہ ہو تو ان پر شیطان غالب ہو جاتا ہے۔ اس لیے جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ بھیڑیا اس بکری کو کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو (الفتح الربانی، ج ۶، ص ۱۷۵)۔

اہل ایمان آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کے حالات کا علم حاصل کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کی رہنمائی کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت معدان بن ابی طلحہؓ کے حالات کے مطابق انھیں اپنے گاؤں میں نماز باجماعت کے اہتمام کی تلقین کی۔

کسی بستی میں نماز باجماعت ترک کر دی جائے تو پھر وہاں شیطان کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ نماز باجماعت کے ترک کر دینے کا یہ وبال ہے تو پورا دین ہی متروک ہو یا بہت بڑا حصہ، تو پھر شیطان کی حکمرانی میں کیا کسر رہ جائے گی، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ جماعت کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہوتی ہے، جس طرح ریوڑ کو

چرواہے کی۔ جس طرح ریوڑ سے دور رہنے والی بکری چرواہے کی حفاظت سے محروم ہوتی ہے اسی طرح تنہا چلنے والا آدمی بھی اللہ تعالیٰ کی اس حفاظت سے محروم ہوتا ہے جو جماعت کو حاصل ہوتی ہے۔

O

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ (میں مسلمان ہونے کے لیے آیا تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ میں حاضر ہوا تو پوچھا: جریر! کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا: اسلام قبول کرنے آیا ہوں۔ کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے چادر پہنائی۔ پھر صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: جب تمھارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کا اعزاز و اکرام کیا کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: جریر! میں تمھیں اس بات کی گواہی کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس بات کی طرف کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تم ایمان لاؤ اللہ پر، یوم آخرت پر، خیرو شر کی تقدیر پر، اور پڑھو فرض نماز اور ادا کرو فرض زکوٰۃ۔ میں نے اقرار کرلیا۔ اس کے بعد آپؐ جب بھی مجھے دیکھتے مسکرا کر ملتے (بیہقی)۔

دعوت کے ذریعے کسی کو اپنا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ داعی اس بات کا ثبوت پیش کرے کہ وہ انسانوں کا ہمدرد و غمگسار اور ان کا خیرخواہ ہے۔ اس کا پہلا اظہار، اعزاز و اکرام ہے۔ جب داعی کسی سے ملے یا اس سے کوئی ملے، وہ کسی کے پاس جائے یا اس کے پاس کوئی آئے تو وہ ہمیشہ حسن سلوک کرے اور حفظ مراتب کا بھی خیال رکھے۔ نبی کریمؐ نے حضرت جریرؓ کو اپنی چادر پہنا کر ان کا خصوصی اعزاز و اکرام کیا اور صحابہ کرامؓ کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ زبردستی اور طاقت سے کسی کی گردن کو تو مسخر کیا جا سکتا ہے لیکن دل کو نہیں۔ دلوں کے دروازوں کو اپنے نظریات کے لیے کھولنا ہے تو انسانی نفسیات کا لحاظ رکھ کر طریقے اختیار کرنا ہوں گے۔ سیرت رسولؐ میں اس حوالے سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

O

حضرت علیؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تین کام ایسے ہیں کہ کسی کو ان کے ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ماں باپ کے ساتھ نیکی، وہ مسلم ہوں یا کافر۔ امانت کی واپسی، اس کا مالک مسلم ہو یا کافر۔ عہد پورا کرنا، مسلمان سے ہو یا کافر سے (بیہقی)۔

جو اخلاقی اقدار مسلمان کی شان اور پہچان ہیں، ان میں اس سے فرق نہیں پڑتا کہ معاملہ مسلمان سے ہے یا غیر مسلم سے۔ یہ طرز عمل خود غیر مسلموں کو اسلام کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ اس کی برتری اور حقانیت کو محسوس کرتے ہیں۔

دعوت عام کی بنیادیں

خرم مرادؒ

عوام کو منظم کرنے اور اپنے ساتھ لے کر چلنے کی جو تدبیر ہم نے اختیار کی ہے' یہ اسی حکمت عملی کا تسلسل ہے جو سارے انبیاکرام نے اختیار کی۔ جماعت اسلامی نے شروع ہی میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ بالآخر ہمیں رائے عامہ سے' عوام کی تحریک سے' اور عوام کی قوت کو جمع کر کے یہ تبدیلی لانا ہے۔ دوسرے ذرائع خواہ وہ اسلحہ ہو یا مظاہرے یا اس قسم کی دیگر تدابیر' اپنے استعمال کے لیے بہت سی شرائط کے طالب ہیں۔ لیکن تبلیغ اور دعوت سے رائے عامہ کو ہموار کرنا' قوت بنانا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر چلنا' یہ انبیاے کرام کی ابتدا ہی سے حکمت عملی رہی ہے اور یہی جماعت اسلامی نے طے کیا تھا۔ اگرچہ اس پر عمل درآمد کی صورتیں حالات کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔

عامتہ الناس کو منظم کر کے اپنے ساتھ لے کر چلنا' بہت پرخطر کام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دین اور ایمان کے لیے جتنا خطرہ اس میں ہے' اتنا کسی اور کام میں نہیں۔ اسی لیے بہت سے لوگ جن بے شمار خدشات اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہیں' وہ واقعی خطرے ہیں اور اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں۔ ان خطرات و خدشات کی طرف انبیا نے بھی ابتدا ہی سے توجہ دلائی ہے۔ ملت اسلامیہ کے صلحا' علما اور دیگر اکابر بھی اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ یہ بڑا پُرخطر کام ہے۔ اس کے اندر نفس کے لیے' دین کے لیے اور ایمان کے لیے جو خطرات پوشیدہ ہیں وہ بہت بڑے خطرات ہیں۔ نفس کے لیے مال سے بڑھ کر فتنہ جاہ کا ہوتا ہے۔ طلب اور شہرت کی خواہش' دو انسان کسی کے پیچھے چلنے لگیں تو کبر کا جذبہ' اور اپنی ذات کے لیے کچھ حاصل کرنے کا جذبہ' بڑی آسانی کے ساتھ شیطان دلوں کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک لاکھ روپے جمع کرنے سے آدمی کو وہ خوشی اور افتخار حاصل نہیں ہوتا جو لوگوں کے دل کو موہ لینے اور افراد کو اپنے ساتھ لے کر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب دو آدمی کہنا ماننے لگیں تو اس سے آدمی کو اپنے مقام کا احساس ہوتا ہے' اور اس مقام و مرتبہ کے لیے اس دنیا میں کیا کچھ جھگڑے نہیں ہوتے۔ لوگ ہمارے پیچھے چلیں اور ہمارے ساتھ ہوں' پیروں میں' علما میں اور سیاسی لیڈروں میں' ہر جگہ یہ

خواہش سب سے بڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے انبیا کا طریقہ کار بڑا پُرخطر اور پُرعزم طریقہ کار ہے۔

تصوف اور وظائف کا طریقہ تو نسبتاً آسان طریقہ ہے کہ آدمی ایک گوشے میں بیٹھ جائے' توجہ حاصل کر لے اور اذکار میں مشغول ہو جائے' اپنے نفس کا تزکیہ کرے' اللہ کا قرب حاصل کرے اور اس کی ذات میں فنا ہو جائے۔ لیکن اللہ کی ذات سے ربط قائم کر کے' اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کے' "اعتصام باللہ" کے ساتھ آدمی عوام اور مخلوق خدا کی طرف رخ کرے' ان کو اپنے مقصد اور نظریے کے پیچھے جمع کرے اور ان کی قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس کو استعمال کر کے تاریخ کا رخ بدل ڈالے' یہ کام بڑے عزم و حوصلے اور صبر و محنت کا طالب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ صبر اور محنت سے فرار کی راہ ہے تو وہ نہیں سمجھتے کہ دراصل کیا چیز پیش نظر ہے۔ یہ انبیا کی راہ ہے' بڑے عزم و ہمت اور صبرواستقامت کی راہ ہے۔

ہمارا سارا لٹریچر جو تزکیۂ نفس کے موضوع پر پایا جاتا ہے' اس میں دو چیزوں یعنی "طریقہ ولایت" اور "طریقہ نبوت" کا ذکر آیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ نے بھی اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔ "طریقہ ولایت" یہ ہے کہ آدمی اپنا تزکیہ کر لے اور کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کر لے۔ "طریقہ نبوت" یہ ہے کہ آدمی مخلوق خدا کے ساتھ رہے اور اس کی اصلاح کرے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ آدمی کسی گوشے میں بیٹھ رہے' خوب عبادت کرے اور اللہ کی ساری نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ بلاشبہ دین میں "طریقہ ولایت" کا اپنا ایک مقام ہے اور یہ بھی بڑی ہمت کا کام ہے لیکن لوگوں میں رچ بس کر رہنا اور پھر اصلاح کی کوشش کرنا' یعنی "طریقہ نبوت" اپنانا' بڑا کٹھن کام ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک جگہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ جو بہت عظیم صوفیا میں سے تھے' انھوں نے کہا کہ محمد عربیؐ ساتویں آسمان پر اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے اور واپس آگئے۔ اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ یہ لکھ کر علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ نبوت کے مزاج اور تصوف کے مزاج میں دراصل یہی فرق ہے۔ تصوف کا تو منتہا ہی یہی ہے کہ وہ حق میں فنا ہو جائے' اور حق کو پا کر اسی میں گم ہو جائے۔ لیکن نبی تو حق کو پا کر واپس آتا ہے اور تاریخ کے دھارے میں اپنے آپ کو جھونک دیتا ہے۔ تاریخ ساز قوتوں کو اپنی مٹھی میں لے کر پھر ایک نئی دنیا تشکیل دیتا ہے جس سے رہتی دنیا تک انسانیت فائدہ اٹھا سکے۔ یہی فرق ہے "طریقہ ولایت" اور "طریقہ نبوت" میں۔ لوگ اس کام کو آسان کام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی شارٹ کٹ یا اقتدار کی ہوس نہیں ہے بلکہ یہ کار انبیا ہے اور منصب نبوتؐ کا تقاضا ہے۔

دعوت کے اس کام کو کرنے کے لیے لوگ انبیا کے طریقہ کار کا نام بھی بار بار لیتے ہیں۔ انبیا کے طریقہ کار میں کچھ اصولی باتیں ہیں اور کچھ تدابیر۔ تدابیر مختلف انبیا کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نو سو سال تک پکارتے رہے: وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ (ھود ۱۱:۴۰) "اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے"۔ یہ دعوت عام کا ایک طریقہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نکلے تو اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ غلام تھے، ان کی ذہنیت اور نفسیات میں غلامی رچ بس چکی تھی۔ ان کا عقیدہ اور ایمان اس حد تک خراب تھا کہ فرعون سے نجات پاتے ہی یہ مطالبہ کر دیا کہ اے موسیٰؑ! پرستش و پوجا کے لیے ہمیں کوئی معبود بنا دیجیے۔ بات بات پر جھگڑتے اور اعتراض کرتے تھے اور یہ شکایت بھی کرتے تھے کہ ہم فرعون کے ساتھ بڑے آرام سے تھے۔ تم خواہ مخواہ ہم کو وہاں سے نکال لائے۔ یہ آزادی ہم کو نہیں بھاتی۔ دعوت کا یہ بھی ایک انداز تھا۔ حضرت مسیحؑ کا اپنا ایک انداز تھا اور نبی کریمؐ نے بھی دعوت کے لیے ایک حکمت عملی اپنائی۔

دعوت کے ان مختلف طریقوں میں کچھ چیزیں بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔ پہلے بھی یہ سامنے رہی ہیں مگر ان کی تذکیر ضروری ہے۔

اعتصام باللّٰہ

سب سے پہلی چیز "اعتصام باللہ" ہے۔ اس سے مراد اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا اور تھامنا ہے۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱) "جس نے اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اسی کو سیدھا راستہ دکھا دیا گیا"۔ صراط مستقیم پر چلنے کا دوسرا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ نے تم کو منتخب کیا ہے، اور ابراہیمؑ کی امت میں داخل کیا ہے اور امت مسلمہ تمھارا نام رکھا ہے، وہاں پہلی ہدایت یہی تھی: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ (الحج ۲۲: ۷۸) "اور اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو"۔ یہ وہ زاد راہ ہے کہ جس کے بغیر کوئی راستہ بھی طے نہیں ہوتا۔ تدابیر تو بہت سی اختیار کی جاسکتی ہیں لیکن اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔

اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے بھی کچھ طریقے ہیں۔ مثلاً اذکار و اوراد، نفلی عبادات اور انفاق وغیرہ۔ مگر اصل چیز تو اللہ پر بھروسا اور اللہ پر ایمان ہے۔ یہی اعتصام کے معنی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کروں۔ ان سب طریقوں میں سب سے بڑھ کر اسی زاد راہ کی ضرورت ہے۔

اصل چیز اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ یقین اور ایمان ہے کہ اس پوری کائنات میں اختیار اور تصرف اس کی مٹھی میں ہے اور کسی دوسرے کو شمہ برابر بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی پتا نہیں ہل سکتا اور نہ کوئی ذرہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے۔ جو پتا اس کی مرضی کے بغیر ہل جائے وہ تو خود خدا ہو جائے گا اور اس کی خدائی سے باہر نکل جائے گا۔ اجازت نہ ہو اور پتا ہل جائے، یہ اس کائنات میں

نہیں ہو سکتا۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ ۳۲: ۵) "آسمان سے زمین تک سارے امر کی تدبیر وہی کرتا ہے"۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (البقرہ ۲: ۲۵۵) "اسی کے لیے ہے ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے"۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (التوبۃ ۹: ۱۱۶) "اسی کی بادشاہت ہے آسمان و زمین میں"۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (البقرہ ۲: ۲۵۵) "اسی کی کرسی کے نیچے آسمان و زمین ہیں"۔ "کرسی" کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اس کے اقتدار سے باہر نہیں۔

تاریخ کی کوئی کروٹ ہو، لیل و نہار کی کوئی گردش ہو، قوموں کا عروج و زوال ہو، اسمبلیوں کا ٹوٹنا اور بننا ہو، غرض کوئی چیز بھی اس کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت یہی توحید کی روح ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کو مان لیا کہ وہ ہے اور اس کے آگے سجدہ کر لیا۔ اس طرح سے اللہ کو ماننے والے تو بے شمار ہیں۔ ایک، مان لینا اور سجدہ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل تو یہ تصور ہے کہ اختیار اس کے پاس ہے، حکم صرف اس کا چلتا ہے، دلوں کو کوئی نہیں بدل سکتا، نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کوئی کان سن سکتا ہے، اور نہ کوئی دل دھڑک سکتا ہے، غرض کوئی حرکت نہیں ہو سکتی، اگر اللہ نہ چاہے۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (یونس ۱۰: ۳۱) "یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟" رات کو لمبی کر کے کون دن لا سکتا ہے اور دن کو لمبا کر کے کون رات لا سکتا ہے؟ کون پیدا کرتا ہے؟ کون آسمان سے پانی برساتا ہے؟ یہ سب باتیں قرآن مجید میں ایک تواتر سے آتی ہیں۔ یہی توحید کی روح ہے۔ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اختیار صرف اس کا ہے۔

دنیا میں خدا کا انکار تو شاذونادر ہی کیا گیا ہے۔ آج بھی ۹۴ فی صد امریکی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۸۰ یا ۹۰ فی صد لوگ اللہ کو مانتے ہیں۔ جہاں بھی آپ چلے جائیں خواہ ہندو ہوں یا بدھ، سب کسی نہ کسی طرح سے خدا کو مانتے ہیں۔ لیکن خدا بااختیار ہے، یہ نہ ماننے کا چلن عام ہے۔ اسی لیے جہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ فرمایا: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (الاعراف ۷: ۵۴) "درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا"۔ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ خالق کو ماننے والے تو سب ہیں کہ خالق ہے، لیکن یہ کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے، اقتدار اس کے پاس ہے، تخت حکومت پر وہ جلوہ افروز ہے، اور اس کی مٹھی میں ساری چیزیں ہیں، یہ بات ماننے والے بہت کم ہیں۔ اس سے صحیح معنوں میں خدا پر ایمان مکمل ہوتا ہے۔ ہر جگہ یہی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔

جدید دنیا کا بھی یہی مسئلہ رہا ہے۔ نیوٹن نے ایک سیب گرتے دیکھا۔ سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا کہ دنیا میں سب چیزیں کشش ثقل پر تھمی ہوئی ہیں۔ نیوٹن بڑا پکا عیسائی بلکہ موحد (unitarian) تھا

اور عیسائیت میں موحد طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس نے کتاب لکھی تو اس کا خیال تھا کہ اس سے مذہب کو بڑی تقویت ملے گی۔ لیکن اس کتاب نے تو مذہب کی جڑ کاٹ دی۔ لوگوں نے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ ہاں' خدا نے پیدا ضرور کیا ہے مگر اب وہ زمین و آسمان کو تھامے ہوئے نہیں ہے بلکہ اب یہ خود بخود قدرت کے قانون پر قائم ہے۔ چنانچہ گھڑی ساز خدا کا عقیدہ یورپ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں آیا۔ جس طرح گھڑی ساز گھڑی بناتا ہے اور گھڑی چلانے کے لیے گھڑی ساز کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے' اسی طرح خدا بھی ہر چیز سے بے دخل ہو گیا ہے' سیاست سے بھی' معیشت سے بھی' اور انسان کی تخلیق سے بھی۔ یہ چیز جہاں ہے وہاں بدترین سیکولرازم اور بدترین ثنویت ہے اور خدا کو بے اختیار اور بے دخل کر دیا گیا ہے۔ آج مادہ پرستی اور اسباب پرستی کا جو سیلاب ہے' اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم سب اس سے متاثر ہیں۔

ہمیشہ سے انسان اس فکر سے متاثر رہا ہے۔ وہ اسباب کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ ایمان میں آزمایش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پردے میں چھپا لیا ہے۔ وہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بارش آتی ہے' سب بتا سکتے ہیں کہ کس طرح بادل آئے' اور بارش ہوئی مگر کہیں خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زلزلہ آتا ہے' قومیں تباہ ہو جاتی ہیں مگر خدا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ انسان پیدا ہوتا ہے مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے پردے کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے اور چھپا لیا ہے۔ اس پردے کو چیر کے دیکھ لینا کہ ہاں' وہ موجود ہے اور اس پر یقین رکھنا' یہی دراصل پوری ہدایت کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا آغاز کیا تو ہدایت کے بعد پہلی بات یہ کہی کہ یُؤمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرہ ۲: ۳) یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں وہی ہدایت پا سکتے ہیں۔ مگر آدمی مجبور نہیں' چاہے تو انکار کر سکتا ہے۔ یہ انسان کے امتحان کا تقاضا تھا۔

اگر خدا اس طرح روشن ہوتا جس طرح آسمان پر سورج' تو ہر آدمی مان لینے پر مجبور ہوتا۔ ماننے پر مجبور تو پہاڑ بھی ہیں اور چاند بھی' ستارے بھی ہیں اور فرشتے بھی' مگر انسان مجبور نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدا اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ خدا نہیں ہے' خدا پانی نہیں برساتا' خدا پیدا نہیں کرتا' خدا رات اور دن کا مالک نہیں ہے' اس کا حکم نہیں چلتا' تو وہ کہہ سکتا ہے۔ کوئی عقل یا تجربہ ایسا نہیں ہے جو اس کو ثابت کر دے کہ خدا ہے۔ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ثابت ہو جائے تو انسان کا امتحان ختم ہو جائے۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو ہماری اساس اور ایمان کی بنیاد ہے۔ یہ ایمان بالغیب ہے جس پر پورے دین کی عمارت تعمیر ہے۔ میں تفصیل میں اس لیے گیا ہوں کہ ہماری دعوت' ہمارے عزم اور ہماری قوت پر اس چیز کے بہت گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

انبیاے کرام علوم غیب پہنچانے آتے ہیں۔ ظاہری علوم مثلاً سائنس اور طب' یہ آدمی اپنی عقل سے خود جان سکتا ہے۔ لیکن وہ علوم جو انسان قطعیت کے ساتھ اپنی عقل سے نہیں پرکھ سکتا وہ ہیں جو انبیا پہنچاتے ہیں۔ اللہ موجود ہے' موت کے بعد اس کو جواب دینا ہے' گو کوئی چیز نگاہوں کے سامنے نہیں آتی لیکن اس پر یقین کہ ہر جگہ اسی کا ہاتھ کام کر رہا ہے' یہ دراصل توحید کی روح ہے۔ اسی وجہ سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کو عرش کے خزانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرش تو مرکز سلطنت ہے اور عرش کے خزانوں میں یہی سب سے بڑا خزانہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے (مَا سَعٰی وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ) اور جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اس تصور کو ہر وقت تازہ رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً نماز ختم کرو تو اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا) پڑھو۔ حضورؐ ہر نماز کے بعد پڑھتے تھے۔ صبح اٹھنے کے بعد جو دعا آپؐ نے سکھائی ہے: مَا شَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَکُنْ (جو اللہ چاہے وہ ہو گا اور جو اللہ نہ چاہے وہ نہیں ہو گا)' اس میں بھی اسی بات کی تعلیم ہے۔ کل کے لیے یہ مت کہو کہ یہ ہو جائے گا بلکہ اِلاَّ اِنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر ہر قدم پر اسی چیز کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ کہیں بھی یہ سوچ جڑ نہ پکڑ سکے کہ اللہ کے چاہے بغیر بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہ دراصل ایمان بالغیب ہے۔ ایمان بالغیب میں تو اور بھی چیزیں ہیں مثلاً جنت اور دوزخ' لیکن میں یہ پہلو اس لیے لے رہا ہوں کہ یہ "اعتصام باللہ" ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو کہ ساری قوت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اسباب نظر آتے ہیں' "مسبب" اور رب نظر نہیں آتا' اس لیے آدمی سبب کو رب بنا لیتا ہے۔ کبھی چاند کے آگے جھکتا ہے اور کبھی ستارے کے آگے۔ کبھی گائے کے آگے جھکتا ہے جو دودھ دیتی ہے' مگر جس نے دودھ سینے میں اتارا اس کے آگے نہیں جھکتا کیونکہ وہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم مختلف چیزوں کے مادی اسباب و علل پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ یہ یوں ہوا اور وہ یوں ہوا۔ بلاشبہ مادی اسباب کو ضرور سمجھنا چاہیے اور تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں لیکن بالآخر ذہن کو اس بات پر مطمئن ہونا چاہیے کہ اصل سبب تو رب ہے۔ وہی مسبب ہے' وہی رب العالمین ہے' وہی رَبّ السَّمٰوٰت وَالْاَرْض ہے' اسی کے کرنے سے سب کچھ ہوتا ہے اور اس کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ چیز جتنی زیادہ حاصل ہو گی اتنی ہی زیادہ قوت پیدا ہو گی۔ جتنا زیادہ اس بات پر پختہ یقین ہو گا' اتنا ہی زیادہ ایمان قوی اور راہ خدا میں استقامت پیدا ہو گی۔ اس کے بعد پھر خواہ کتنی ہی بڑی تعداد میں لوگ

تحریک میں شامل ہو جائیں آپ گمراہ نہیں ہوں گے۔ کتنے ہی لوگ آپ کی تعریف کریں' آپ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ کسی کی تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا)۔ کسی کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی چند دانے یا چند سکے بھی کسی کو دینا چاہے تو نہیں دے سکتا تو پھر کسی کی تعریف سے کیا فرق پڑے گا۔ ایسے میں آزمایشیں آئیں گی بھی تو تربیت کا ذریعہ بنیں گی اور مزید پختگی کا باعث ہوں گی' نیز لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی قوت بھی پیدا ہو گی۔

صحابہ کرامؓ میں یہی قوت تھی جس کے بل پر ساری سلطنتیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سب بڑے عبادت گزار اور تہجد گزار تھے۔ وہ تجارت کرتے تھے' کاروبار کرتے تھے' شادیاں کرتے تھے اور بال بچے دار تھے۔ ان کی زندگی دنیا والوں سے مختلف نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے فرائض کے پابند تھے' اور اس کے محرمات سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ انھیں اپنے اللہ پر کامل یقین تھا جس کے بل پہ وہ قیصرو کسریٰ تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک اِن کی حیثیت پتلیوں اور مٹی کے گھروندوں سے زیادہ نہیں تھی۔ انھیں کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ بادشاہ کے دربار میں نیزے سے قالین کو چاک کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ عرب کے ان بدوؤں اور معمولی انسانوں میں یہ قوت اس لیے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اللہ کی قوت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رب تو بس ایک ہے باقی سب اسباب ہیں' اور تمام اسباب اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ کام اسباب سے نہیں بنتا بلکہ رب کے چاہنے یا نہ چاہنے سے بنتا ہے۔

یہ وہ چیز ہے جو "اعتصام باللہ" میں پوشیدہ ہے۔ اس کو آپ جتنا حاصل کریں گے' اس پر جتنا آپ کا یقین بڑھے گا' یہ جتنا آپ کی گفتگو کا حصہ بنے گا' اتنا ہی مفید ہو گا اور تقویت ایمان کا باعث بنے گا۔ ماشاء اللّٰہ' ان شاء اللّٰہ' یہ سب جملے کیا ظاہر کرتے ہیں؟ یہ اسی چیز کی تائید میں ہیں اور ہماری تہذیب و تمدن اور سوچ و فکر میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں جزو کلام بن گئے ہیں مگر اب ہم ان کے معنی کھو چکے ہیں اور ان کا اثر بھی کھو چکا ہے۔

مائیں بچپن میں کہانیاں سناتی تھیں کہ ایک تھا بادشاہ اور ہمارا تمھارا خدا بادشاہ--- مسلمان بچوں کی کہانی یہاں سے ہی شروع ہوتی تھی۔ مجھے بھی یاد ہے کہ ہماری والدہ کہانی سناتی تھیں تو کہا کرتی تھیں کہ ہمارا تمھارا بادشاہ اللہ۔ بادشاہ تو بہت سے نظر آئیں گے مگر اصل بادشاہ تو اللہ ہے۔ اس کا مقصود یہ تصور تھا کہ بادشاہ کے معنی بااختیار ہستی کے ہیں۔ وہ صرف عبادت یا پرستش کے لیے نہیں ہے بلکہ اختیار' ملکیت'

ساری چیزیں وہی دیتا ہے۔

"اعتصام باللہ" کی تحریک کے لیے کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک میں کام کرنے کے لیے، کام کو آگے بڑھانے اور وسعت دینے کے لیے، اگلے مراحل میں لے جانے کے لیے، بڑی بڑی قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لیے، اور بلاخطر لوگوں کو اپنے پاس جمع کرنے، ان کی رہنمائی کرنے، اور اپنے آپ کو سارے فتنوں اور خطرات سے بچانے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ فتنے تو پھر بھی ہوں گے مگر جب آدمی یہ سمجھ لے گا کہ میں بالکل اپنے رب کی مٹھی میں ہوں، میرے کرنے سے کچھ نہیں ہو گا، جو ہو گا اس کے کرنے سے ہو گا تو پھر وہ پریشان نہیں ہو گا اور حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہو گا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے اس کی بار بار تاکید کی ہے۔ غزوۂ بدر کی پہلی فتح ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً بتا دیا کہ تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا، اور تم نے مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال ۸:۱۷) "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا"۔ گویا پہلے ہی قدم پر، پہلی فتح کے بعد بالکل واضح کر دیا کہ یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے کرنے سے کچھ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی تمام تر کوشش کرنے اور تمام ممکنہ وسائل کی فراہمی کا بھی حکم دیا کہ تلوار بھی اٹھاؤ، لڑو بھی اور تدبیر بھی کرو۔ صحابہ کرامؓ کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان پر واضح تھا کہ کرنا سب کچھ ہے لیکن سمجھنا یہی ہے کہ سب اللہ نے کیا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے کرنا ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ اللہ کی مدد حاصل ہو گی تو دنیا ہماری ہو گی۔ ان دونوں کے درمیان ایک باریک سا ربط ہے۔ سب کچھ ہو مگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

جب یہ ربط ذہن میں قائم ہو جائے تو پھر "اعتصام باللہ" کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ "اعتصام باللہ" ہی قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر لوگ نعرے لگائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ جمع ہو جائیں تو آدمی نہیں بھاگتا۔ تعریف ہوتی ہے تو اس سے نفس میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا۔ لوگ حضورؐ کے سامنے آپؐ کا تھوک زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، آپؐ کے بال لے لیتے تھے اور انھیں سنبھال کر رکھتے تھے، وضو کا پانی لے کر منہ پر مل لیتے تھے مگر حضورؐ کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آپؐ بھی انسان تھے۔ سب کی طرح شیطان آپؐ کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا، مگر آپؐ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی تائید سے ہوتا ہے، جو کچھ ملتا ہے اسی سے ملتا ہے، اور جو کچھ ہے اسے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دراصل "اعتصام باللہ" کے اندر یہ سوچ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعوت اور

تحریک کا کام کرتے ہوئے قوت کا یہ سرچشمہ جتنا زندہ رہے گا، جتنی زیادہ اس کو تقویت پہنچائی جائے گی، اتنا ہی خطرات سے بچ نکلنے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ ان شاء اللہ!

یہ نہیں ہو گا تو ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھ کر بھی فتنے کے اندر مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک آدمی ہزاروں اشرفیوں میں کھیل رہا ہو، تخت شاہی پر بیٹھا ہو، اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، سب اس کے کرنے سے ہوتا ہے، دل اسی سے لگا ہوا ہو، تو وہ ولی اللہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھا ہو، اس کے پاس دو پیسے ہوں مگر اسی میں دل اٹکا ہوا ہو، بار بار گنتا اور شمار کرتا ہو تو وہ دنیا پرست ہے۔ درحقیقت اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ آپس میں جمع ہیں یا نہیں ہیں، لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا نہیں رہتے ہیں، اچھا کھاتے ہیں یا نہیں کھاتے ہیں، فرق تو اس سے پڑتا ہے کہ دل کہاں اٹکا ہوا ہے، قوت کا منبع اور سرچشمہ کس کو سمجھتے ہیں؟ یہ دراصل "اعتصام باللہ" ہے۔

حنیفیت

"اعتصام باللہ" کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے "حنیفیت" کا مطالبہ کیا ہے۔ "حنیفیت" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کا حنیف کہا گیا ہے۔ دین کے لیے "حنیف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ حنیف بن جاؤ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں سود، شراب کی حرمت اور دیگر تفصیلی احکامات نہیں دیے گئے بلکہ سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا گیا تھا کہ اللہ کے لیے حنیف بن جاؤ۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (البینۃ ۹۸: ۵) "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یک سو ہو کر"۔

یہ وہ بنیادی مطالبہ تھا جو مسلمانوں سے کیا گیا تھا۔ "حنیف" کا لفظ قرآن میں بار بار آتا ہے۔ "حنیف" کا ترجمہ ہمارے اردو مترجمین نے طرح طرح سے کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے یکسو ہو جانا اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کا ہو رہنا۔ شاہ عبدالقادرؒ کا بڑا خوب صورت اور مختصر ترجمہ ہے کہ اللہ کے ہو رہو۔ گویا اللہ کے بن کے رہو، اسی کے بن جاؤ۔ اس میں ابھی عمل کا مطالبہ نہیں آتا۔ یہ تو پوری شخصیت، پوری ذہنیت اور بنیادی سوچ کی تعمیر کا عمل ہے۔

"حنیفیت" کا مطالبہ بار بار کیا گیا ہے۔ اللہ نے خود کہا ہے کہ سب سے آسان دین تو دین حنیف ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیمؑ کی مثال کو بطور خاص پیش کیا گیا ہے۔ مگر مقصود و مطلوب صرف اللہ کا ہو رہنا ہے۔ "حنیفیت" بھی "اعتصام باللہ" کے اندر شامل ہے۔ اس لیے کہ اللہ کو تو وہی بندہ قبول ہے جو پورے کا پورا اس کا ہو جائے۔ اس کے بعد گناہ، غلطیاں اور خامیاں ہونا، یہ کوئی بڑی

بات نہیں۔ انسان تو صفاتی مخلوق ہے۔ اگر وہ گناہ نہ کرتا تو اللہ کوئی دوسری ایسی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور گناہ سے دل شکستہ ہو کر اس کی بنتی، اسی کی ہو کر رہتی، اسی کی طرف رجوع کرتی اور اس کے در پر جا کر ہاتھ پھیلاتی۔ جو غلطیوں سے مبرا اور خطاؤں سے پاک ہیں اور ویسے ہی اس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، فرشتے--- وہ اس کو اتنے محبوب نہیں ہیں۔ اس کو تو وہ محبوب ہے جو گناہ کر سکتا ہو اور نہ کرے، اور اگر گناہ ہو جائے تو اس کی طرف پلٹے، رجوع کرے اور توبہ کرے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی صرف اس کا بن جائے اور اسی کا ہو رہے۔ جب ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا دنیا کی پوری عنان ان کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ درحقیقت وہ لوگ چاہییں جو صرف اسی کے بن جائیں اور اسی کے ہو رہیں۔

جب یہ دو چیزیں ذات کا حصہ بن جائیں اور تحریک کے کام میں شامل ہو جائیں تو پھر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ اگر منہ میں نوالہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے رکھ رہا ہے۔ اگر پانی ٹھنڈا ہے اور اسے پی رہا ہے تو وہ اسے پلا رہا ہے۔ اگر مرض سے صحت یابی ہو گئی تو ڈاکٹر کی دوا سے نہیں ہوئی بلکہ اس نے صحت دی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی چیز کا اعلان کیا تھا کہ وہی کھلاتا ہے، وہی پلاتا ہے اور بیمار پڑ جاؤں تو وہی شفا دیتا ہے۔ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ○ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ○ (الشعراء ۲۶: ۷۹-۸۰) "جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے"۔ اسی طرح اگر آنکھ دیکھتی ہے تو اس کے دکھانے سے دیکھتی ہے، کان سنتا ہے تو اس کے سنانے سے سنتا ہے، جیب میں پیسہ آتا ہے تو اس کے دینے سے آتا ہے۔ نیز یہ پہلو کہ وہ راستہ کیوں اختیار کیا جائے جو اسے ناپسند ہے، آنکھ وہ چیز کیوں دیکھے جسے وہ نہیں دکھانا چاہتا، اور وہ چیز کیوں نہ دیکھی جائے جس کو وہ چاہتا ہے کہ آنکھ اس پر جمی رہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر تمام تر اطاعت، محبت اور شکر کا انحصار ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق، تعلق باللہ سے ہے مگر یہ اس چیز کا سرچشمہ ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے، جو دے رہا ہے وہ دے رہا ہے، اور اگر کسی کا حکم چل رہا ہے تو اسی کا حکم چل رہا ہے۔ چونکہ سارے اسباب پردے میں ہیں اور نگاہ پردوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے، نتیجتاً آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انبیا ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں اور غیب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ پھر آدمی پردے کے پیچھے بھی آج ہی وہ دیکھ لیتا ہے جو کل موت کے بعد نظر آئے گا۔ وہ آج ہی دیکھ لیتا ہے کہ ہاں، وہ ہستی وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ پانی بادلوں سے نہیں برس رہا، وہ برسا رہا ہے۔ کس نے کھیتی اگائی اور کس نے آسمانوں سے پانی اتارا، تم نے یا ہم نے؟ قرآن یہ سوال بار بار کرتا ہے تاکہ دل

کے اندر یہ بات جڑ پکڑ جائے کہ ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں لیکن حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ اس سے محبت اور جذبہ شکر بھی پیدا ہو گا' اطاعت اور نافرمانی سے بھی آدمی بچے گا۔

قرآن نے ابتدا ہی سے ان دو چیزوں کی تاکید کی اور اسی پر اپنا پورا زور رکھا۔ جیسے جیسے یہ سوچ پختہ ہوتی گئی تو دیگر مطالبات پورے ہونے کی بنیاد بھی بنتی چلی گئی۔ اگر یہ پہلو کمزور ہو تو آدمی خواہ کتنے ہی اصول و ضوابط بنا لے' کتنے ہی احکامات جاری کر دے اور مطالبات پیش کر لے مگر وہ قوت پیدا نہیں ہو سکتی جس سے دنیا زیر نگیں ہو جائے۔ دنیا تو اس وقت زیر نگیں ہو گی جب آدمی اپنے خالق کا صحیح معنوں میں "حنیف" بن جائے۔ "حنیفیت" کی یہ صفت توحید سے حاصل ہو گی۔ لاحول ولا قوۃ' یہ عرش کا خزانہ ہے۔ پوری کائنات میں کوئی چیز اللہ کے دائرے سے باہر نہیں۔ اس کی "کرسی" میں زمین و آسمان سب سمائے ہوئے ہیں۔

اس پختہ سوچ' یقین اور تصور کے ساتھ جب آپ دعوت کا کام کریں گے' لوگوں کے پاس جائیں گے' دعوت دیں گے' ان کو جمع کریں گے تو نفس کے فتنوں' شہرت کی طلب' کبر اور دعوت کے دیگر خطرات سے آپ بڑی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔ اس بات کی ضمانت تو نہیں دی جا سکتی کہ شیطان وسوسے نہیں ڈالے گا اور دل میں وسوسے نہیں پیدا ہوں گے اور خیالات نہیں آئیں گے۔ اس بات کی کوئی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہ ایک لحاظ سے آزمائش کے لیے ضروری بھی ہیں' لیکن یہ کہ پھر آپ کی حیثیت ایک مضبوط قلعے کے اندر محفوظ فرد کی سی ہو گی اور اس کے اندر آپ فوراً بچاؤ کر لیں گے۔ پھر آپ آگے بڑھ کر بڑے بڑے خطرات مول لے سکیں گے' ان سے ڈر کے اور کانپ کے کسی گوشے میں نہیں بیٹھے رہیں گے۔ پھر آپ حضرت موسیٰؑ کی طرح رسی کے سانپ دیکھ کر نہیں ڈر جائیں گے' آپ کے پاس تو عصائے موسیٰؑ ہو گا' وہ اژدہا بن کر ان سارے وسوسوں اور خدشات و خطرات کو نگل جائے گا۔ پھر آپ اپنے مقام پر کھڑے ہو کر یہ سارا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایسی ہی عاجزی' تواضع و انکساری اور بندگی اور اعتصام باللہ و حنیفیت درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کی تاکید فرمائی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۳) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۱) جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

اللہ نے ہدایت کے لیے یومنون بالغیب (ایمان بالغیب) سے آغاز کیا اور قل ھو اللہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ کہو کہ اللہ ایک ہے' اس جیسا کوئی نہیں ہے' وہ بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ پھر سورہ

اخلاص کو بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے کہ اسے فجر کی نماز میں پڑھو، مغرب کی نماز میں سنتوں میں پڑھو، غرض سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کو پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے کہ ان دونوں کے اندر اسی چیز کی تعلیم موجود ہے۔ جو بھی اس کو جتنا سمجھے گا، حاصل کرے گا اور جذب کرے گا، اتنا ہی اس کے اندر قوت پیدا ہو گی۔ اس میں کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے، اپنے آپ کو تیار کرنے کی بات ہے۔ تیاری بھی کسی گوشے میں بیٹھ کر نہیں ہو گی بلکہ میدان میں اتر کر ہو گی۔ اگر آپ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں تو ان شاء اللہ ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔

دعوت عام، انقلاب اور تبدیلی کے حوالے سے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم کوئی شارٹ کٹ چاہتے ہیں یا جلدی مچا رہے ہیں۔ اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوئی شارٹ کٹ یا جلدی نہیں مچانا چاہتے۔ اس لیے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ جلد تبدیلی لانا چاہے گا تو کوئی شارٹ کٹ کی صورت پیدا کر دے گا اور اگر لانگ کٹ کرنا چاہے گا تو لانگ کٹ کر دے گا۔ یقیناً ہماری خواہش یہی ہے اور ہونی چاہیے کہ دین آج ہی نافذ ہو جائے لیکن اس کے لیے ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے، بغاوت نہیں کر سکتے۔ اگر دیر ہے تو انتظار کرنا ہو گا اور اگر اللہ کو جلد منظور ہوا تو خود کوئی راستہ نکال دے گا۔ تاہم دعوت کے لیے ہم ہر موثر ذریعہ اور طریقہ ضرور اپنائیں گے اور راضی بہ رضا رہیں گے۔

اگر ہم لوگوں کو اللہ کی طرف، اعتصام باللہ کی طرف اور حنیف بن کر حنیفیت کی طرف دعوت دیں تو پھر عوام کے دلوں کے راستے بھی کھلیں گے، ان کے اندر استعداد اور قوت بھی پیدا ہو گی اور وہ ساتھ بھی آئیں گے نیز ان خطرات سے بھی محفوظ رہیں گے جو خطرات "طریقۂ نبوت" میں ہیں اور جن سے بچنے کے لیے لوگوں نے "طریقۂ ولایت" اختیار کیا۔

بلاشبہ نبوت کا راستہ بڑا مشکل راستہ ہے کہ دنیا میں بھی رہو اور دنیا سے بے نیاز بھی رہو۔ اس سے مشکل آزمایش اور کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا سے کٹ کے آدمی دنیا سے بے نیاز ہو سکتا ہے مگر دنیا میں سر سے پاؤں تک غرق ہو اور پھر بھی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھے، اور اللہ کا ہو رہے، یہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب آدمی سارے اسباب کے پردے چاک کر دے، سبب کو رب نہ بنائے بلکہ اسی ایک کو رب بنائے جو ساری کائنات کا رب ہے۔ یہ وہ بنیادی سوچ اور فکر ہے جو اس راہ میں چلتے ہوئے ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ پہلے ہی قدم پر اس کو سمجھنا اور خوب جان کر آگے بڑھنا بہت ضروری ہے (جاری) (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)۔

دورہ جاپان و چین

مشاہدات و امکانات

قاضی حسین احمد

امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد اوائل مارچ میں جاپان اور چین کے ۱۵ روزہ دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ اس حوالے سے ہم نے ان سے کچھ سوالات کیے جن کے جواب انھوں نے مرحمت فرمائے۔ اس انٹرویو میں تعاون کے لیے ہم انور نیازی صاحب کے ممنون ہیں۔ (مدیر)

سوال: چین اور جاپان کے معاشروں میں آپ نے وہ کون سے پہلو دیکھے ہیں جن کی بنیاد پر وہاں اسلام کے فروغ کے امکانات کو وسیع کیا جا سکتا ہے؟

جواب: چین اور جاپان کے حالات اور معاشرے الگ الگ ہیں اور دونوں کا ایک جواب دینے کے بجائے' ان کے بارے میں الگ الگ بات مناسب ہوگی۔ چین میں مجھے کوئی زیادہ وقت نہیں ملا' میں نے وہاں صرف تین دن گزارے ہیں اور اس دوران صرف سرکاری ملاقاتیں کیں۔ عوام کے اندر گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔ چین ایک ارب ۲۵ کروڑ کی آبادی کا ملک ہے۔ اس کی ایک سرحد پاکستان اور افغانستان اور دوسری بحرالکاہل اور مشرق بعید کے ممالک کے ساتھ ملتی ہے۔ اتنی بڑی اور وسیع آبادی کے بارے میں صرف تین دن کی سرکاری اور رسمی ملاقاتوں کے بعد کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مقابلے میں جاپان رقبے کے لحاظ سے چھوٹا' ۱۰ کروڑ کی گنجان آبادی کا ملک ہے۔ یہاں مجھے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ۱۲ دن کے دورے میں ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ رابطہ ہوا اور بے تکلفی کی فضا میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ان سے تبادلہ خیال ہوا۔ وہاں پر رہنے والے ان پاکستانیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو سالہا سال سے وہاں رہایش پذیر ہیں۔ جاپان کے بارے میں نسبتاً زیادہ معلومات کی بنیاد پر بہتر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چین کے حالات کے بارے میں بھی وہاں کئی سال سے رہنے والے پاکستانی احباب کی معلومات کی روشنی میں اظہار خیال کی کوشش کروں گا۔

اس دورے کے بارے میں یہ بتانا مناسب ہو گا کہ جاپان کا دورہ میں نے جاپانی وزارت خارجہ کی دعوت پر کیا۔ اس کا اہتمام اسلام آباد میں جاپانی سفارت خانے نے کیا تھا۔ ان دوروں میں جماعت اسلامی کے امور خارجہ کے ذمہ دار عبدالغفار عزیز جو میرے معاون خصوصی ہیں، میرے ساتھ تھے۔

جاپانی معاشرے کا جو خاص پہلو مجھے نظر آیا وہ یہ ہے کہ یہ بنیادی طور پر لادین معاشرہ ہے۔ اس کا کوئی خاص مذہب نہیں ہے۔ اس میں کچھ روایات تو موجود ہیں جنھیں مذہبی اور کلچرل روایات کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن باقاعدہ کسی مذہب کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی گہری وابستگی نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے بادشاہ کو تقریباً معبود کا درجہ حاصل تھا لیکن جنگ میں شکست سے جاپانی قوم شدید صدمے سے دوچار ہوئی اور ان کا اپنے بادشاہ کے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی علامتی بادشاہ بننے کا راستہ اختیار کیا اور جاپان ایک مکمل جمہوری ملک بن گیا۔ اس سے قبل بھی پارلیمنٹ موجود تھی۔ ۱۸۹۰ء میں جاپان میں ایک آئینی بادشاہت تھی۔ ایک اصلاحی تحریک میجی کے نتیجے میں جاپانی معاشرے اور سیاست میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی جاپان نے تعلیم اور ٹکنالوجی میں ترقی کرنا شروع کر دی تھی۔ یہاں کے دو بڑے مذاہب ہیں۔ ایک بدھ مت اور وہ بھی بدھ مت کا جاپانی ایڈیشن۔ دوسرا شنٹوازم (روایتی مذہب)۔ عیسائی مذہب بھی وہاں کے مذاہب میں شمار ہوتا ہے اگرچہ عیسائیت کے ماننے والوں کی تعداد ایک فی صد ہے۔ کیتھولک چرچ کی کوششوں سے عیسائیت کے بارے میں عام جاپانیوں کو کچھ معلومات حاصل ہیں لیکن بائبل کے قصے کہانیاں تمام جاپانی بچوں کو معلوم ہیں۔

شنٹوازم اور بدھ مت کے ساتھ لوگوں کی وابستگی برائے نام ہے۔ ان کے بڑے بڑے معبد موجود ہیں لیکن ان کے اندر جا کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عبادت خانے کی بجائے میوزیم ہیں اور لوگ سیر کی غرض سے وہاں آتے ہیں۔ ان کے روایتی مذاہب میں ایک اللہ اور خالق کا تصور موجود نہیں ہے، لیکن عموماً یہ اپنے آبا و اجداد کی ارواح کے ساتھ رابطہ رکھنے، ان کی خاطر نذریں ماننے اور ان سے مدد اور برکت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی خوشی اور فلاح کی خاطر بہت سی رسومات سرانجام دیتے ہیں۔ لوگوں میں روحانی اور مذہبی طور پر ایک گہرا خلا موجود ہے جسے پر کرنے کے لیے عیسائی رومن کیتھولک چرچ سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں لیکن بڑے پیمانے پر کوئی پذیرائی نظر نہیں آتی۔ جاپانی فطرتاً ملنسار اور نرم خو ہیں۔ ان کی خواتین کو روایتی طور پر خدمت اور ادب کا درس دیا گیا ہے۔ مغربی اثرات کے باوجود جاپانی عورتیں اپنی اس روایت سے مکمل طور پر باہر نہیں نکل سکی ہیں۔ ہر بڑے ادارے میں استقبالیے میں دو عورتیں عموماً موجود رہتی ہیں جو آنے والوں کے استقبال میں تقریباً رکوع کی سطح تک جھکتی ہیں اور مسکرا کر استقبال کرتی ہیں۔ خواہ آپ کہیں جائیں، کسی دکان یا دفتر میں جائیں، کسی گاڑی میں بیٹھیں، کسی سے آمنا سامنا ہو، ہر جگہ عام جاپانی بھی استقبالیہ کلمات کہتے ہیں اور جھک کر ملتے ہیں۔ انکسار اور ملائمت ان کی گھٹی

میں پڑا ہے۔ بلند آواز سے بات نہیں کرتے۔ دوسرے کی بات غور سے سنتے ہیں۔ ان کے اس نرم اور ملائم رویے' انکسار اور تہذیب و ثقافت کی وجہ سے وہاں رہنے والے پاکستانیوں کا خیال ہے کہ جاپانیوں کی حقیقی رائے کے بارے لوگوں کو کم ہی پتا چلتا ہے۔

دین اور مذہب انسان کی فطری ضرورت ہے۔ کسی مافوق الفطرت ہستی کے سامنے جھکنا انسانی طبیعت میں شامل ہے۔ جاپان کے لوگوں کی پرانی مذہبی روایات جدید علوم اور ٹکنالوجی کی پیش رفت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں اس لیے وہ اپنے اندر ایک روحانی پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اسلام جو دین فطرت ہے جاپان میں اس کی اشاعت کے بہت امکانات موجود ہیں' لیکن بدقسمتی سے اس سلسلے میں کوئی بڑی کوشش اب تک نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کی حکومتیں ان لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو مسلمانوں کو بھی اپنے مذہب سے دور کرنے کی فکر میں ہیں' چہ جائیکہ نئی آبادیوں تک اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے امت کے وسائل کے استعمال پر سوچیں۔ مذہبی اور دینی تنظیموں کی تبلیغی کوششیں زیادہ تر مسلمانوں کی اپنی آبادی تک ہی محدود ہیں اور ان کے پاس عام معاشرے تک دعوت پہنچانے کے لیے وسائل موجود نہیں۔ جاپان میں جو تھوڑے بہت مسلمان موجود ہیں' وہ لیبر کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر وہاں رہ رہے ہیں جنھیں ہر وقت پولیس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ پاکستان کی لیبر کلاس میں بڑی تعداد دین سے وابستہ ہے لیکن غیر قانونی ہونے کی وجہ سے اطمینان کے ساتھ دین کا کام کرنے کا موقع انھیں میسر نہیں ہے۔ جو لوگ خود غیر قانونی طور پر رہتے ہوں' وہ وہاں کی آبادی کو کیا متاثر کر سکتے ہیں۔

اس کے باوجود باہر کے مسلمانوں' خاص طور پر پاکستانی مسلمانوں نے ہر بڑے شہر میں کچھ مساجد قائم کی ہیں جن کو انھوں نے اپنی تبلیغی کوششوں کا مرکز بنایا ہوا ہے۔ نومسلم محدود تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر جاپانی عورتیں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کی ہیں۔ جاپانیوں سے ملاقات سے ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ اسلام کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور ان میں اسلامی تعلیمات کے لیے پذیرائی موجود ہے۔ لیکن جاپانی زبان میں اسلامی کتب محدود تعداد میں ہیں۔ کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ہے جو جاپان کے معیار پر بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہو۔ جاپان کا ایک روزنامہ ایک کروڑ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ کتابوں کو خریدنا اور پڑھنا عام جاپانی کا مشغلہ ہے۔ اس لیے وہاں پر ہر شہر میں کتابوں کی کئی کئی منزلہ بڑی بڑی دکانیں ملتی ہیں' لیکن ان میں اسلام کے بارے میں کوئی کتاب بہ مشکل ملے گی۔

ٹوکیو میں ایک اسلامک سنٹر قائم ہے لیکن اس کی آواز بہت نحیف ہے۔ جاپانی معاشرے میں مادی ترقی کے اس دور میں لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بہت موثر اور مضبوط آواز کی ضرورت ہے۔ اسلام کی ضرورت بھی موجود ہے اور جاپانی معاشرت تقاضا بھی کرتی ہے۔ ترقی کے باوجود وہاں کی عام

اور گھریلو زندگی میں نفسا نفسی پائی جاتی ہے۔ ان حالات میں اسلام ان کی ضرورت ہے، لیکن اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کسی بلند آہنگ آواز اور کوشش کی ضرورت ہے۔ اس وقت جاپانی معاشرہ مغربی میڈیا کے زیر اثر ہے اور امریکہ سے مرعوب ہے۔ مغربی میڈیا کا یہ پروپیگنڈا کہ مسلمان دہشت گرد اور انتہاپسند ہیں، جاپان میں بھی عام ہے۔ اس تصور کے توڑ کے لیے اسلام کی حقیقی تعلیمات سے لوگوں کی آشنائی ضروری ہے۔ اسلام آباد میں جاپان کے سابق سفیر جنھوں نے میرے اس دورے کا اہتمام کیا تھا، اس ضرورت کا احساس کر رہے تھے۔ ان کے دل میں اسلام کے لیے نرم گوشہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جاپانی اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کر سکیں۔ اسی طرح کے کچھ جاپانی دوست جاپان میں بھی موجود ہیں۔ انھیں قریب لا کر اس کام کا منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ جاپان کی کوئی بڑی شخصیت کسی بڑے اشاعتی ادارے کے ذریعے سے اسلام کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو عام جاپانی کو اسلام کے بارے میں درست معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔

س: مغربی تہذیب کا مسلم معاشروں (بشمول پاک و ہند) اور ان مشرقی معاشروں نے جس طرح سے مقابلہ کیا، اس میں کیا فرق ہے؟

ج: مشرق کا مسلم معاشرہ اپنی پسماندگی کے باوجود اور اسلام کے بنیادی عقائد سے قدرے انحراف کے باوجود بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ قرآن و سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس حق و باطل میں تمیز کرنے کا ایک معیار (فرقان) موجود ہے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کا نام دیا ہے یعنی حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے والی کسوٹی۔ حضورؐ کی پاکیزہ سیرت اپنی پوری تفصیل اور آب و تاب کے ساتھ اسلامی معاشرے میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ قرآن کے ساتھ اور نبی اکرمؐ کے ساتھ محبت ہر مسلمان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی گنہگار مسلمان کیوں نہ ہو، وہ قرآن اور حضورؐ کے معیار حق ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے مغربی تہذیب اسلامی معاشروں کی بنیادوں کو ہلانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور بہ ظاہر مغربی تہذیب کے فروغ کے باوجود مسلمان اپنی بنیاد پر قائم ہیں۔ جب بھی مسلمانوں کو موقع ملتا ہے، اپنی اس تہذیبی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جاپان اور چین دونوں کے معاشروں نے مغربی اقدار کو قبول کر لیا ہے۔ وہاں اس طرح کا کوئی معیار حق و باطل موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ان میں اور مغربی معاشروں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی عیسائیت اس میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے کہ وہ مادی تہذیب کا مقابلہ کر سکے۔ مغربی معاشرہ عیسائی اخلاقیات کی بجائے جاہلی مادی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کی اخلاقی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ یہی صورت چین اور جاپان کے معاشرے کی بھی ہے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ، معیار زندگی میں بہتری اور ٹکنالوجیکل طاقت کا حصول ہے۔

تہذیبی طور پر جاپان' چین اور مغربی ممالک میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ البتہ چونکہ نسل اور زبان میں نمایاں فرق ہے اور روایات اور تاریخ کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں' اس لیے جاپان اور چین کا الگ الگ تشخص ہے۔ جاپان اور چین میں آپس میں گہری مغائرت ہے اور ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے ان میں باہمی اعتماد کی فضا نہیں ہے۔ مغربی ممالک خاص طور پر امریکہ کی کوشش ہے کہ جاپان اور چین ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ جاپان پر امریکی تہذیب کا زیادہ اثر ہے۔ جاپان میں رہنے والے پاکستانیوں کا خیال ہے کہ ان کی نئی نسل امریکی تہذیب سے مرعوبیت کی حد تک متاثر ہے' جب کہ چین اگلے ۱۰ برس میں امریکہ کے مقابلے کی طاقت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چین اپنے رقبے' وسائل اور صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے بڑا ملک ہے اور اسی وجہ سے اس کے اندر ایک اعتماد بھی موجود ہے۔

س: ان معاشروں میں عورت کا کیا کردار ہے اور وہ کن مسائل سے دوچار ہے؟

ج: جاپانی معاشرے میں عورت روایتی طور پر مرد کی خدمت کے لیے اور اس کو خوش رکھنے کے لیے ہے۔ مغربی معاشرے میں بھی بہ ظاہر عورت کی مرد سے برابری اور اختیارات میں شریک کرنے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود عورت دل بہلانے کی چیز ہے۔ عورت کو جاپان میں' اور مغربی معاشرے میں بھی' گھر کی خدمت کے ساتھ ساتھ کام پر بھی لگایا گیاہے۔ اس کو اپنی روزی خود کمانی پڑتی ہے۔ شادی کو ایک تکلف ہی بنا دیا گیا ہے اور اس سے جان چھڑانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جاپان میں مغربی تہذیب کے اثرات کے تحت اگرچہ بہ ظاہر عورت کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے' لیکن حقیقت میں عورت نہ آزاد ہے' نہ اس کو حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی اس کے اندر اعتماد ہے۔ عورت کا احترام بھی موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اگر کسی جاپانی عورت کو کسی مسلمان سے شادی کرنے کا موقع مل جائے تو وہ اسلام بھی قبول کرلیتی ہے اور مسلمان خاوند کے ساتھ خوش بھی رہتی ہے۔ بہت سارے پاکستانی نوجوانوں نے جاپانی خواتین سے شادیاں کی ہیں اور وہ بہت اچھی اور خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔

س: چین میں اشتراکی تجربہ آپ نے کس حال میں پایا؟

ج: چین کا معاشرہ مرکزی طور پر منضبط معاشرہ ہے' لیکن خود چینی قیادت کے کہنے کے مطابق جب انھیں ۱۹۴۹ء میں آزادی ملی تو اقتصادی میدان میں انھوں نے روسی تجربے کو اپنایا جس کے نتیجے میں وہ تیزی کے ساتھ ترقی نہ کر سکے۔ اگرچہ انھیں کچھ فوائد حاصل ہوئے لیکن جب سے انھوں نے مارکیٹ اکانومی اپنائی ہے ان کی مجموعی قومی پیداوار میں سات فی صد سے لے کر ۱۳ فی صد تک سالانہ ترقی ہو رہی ہے جو دنیا میں بلند ترین شرح اضافہ ہے۔ چینی معیشت بہت تیزی کے ساتھ ترقی کررہی ہے اور وہ دنیا کی بہت بڑی معیشت بننے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس وقت ہانگ کانگ کو ساتھ ملانے کے بعد ایک ملک اور دو نظام کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اشتراکی نظام کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ جہاں

تک لوگوں کی تنظیم اور آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کا تعلق ہے تو انھوں نے ابھی تک اس طرح کی پابندیاں برقرار رکھی ہیں کہ معاشرے پر ان کی گرفت ڈھیلی نہ پڑ جائے۔ چین میں رہنے والے ایک پاکستانی نوجوان کے کہنے کے مطابق چین کی بنیادی فکرمندی ان کی اقتصادی ترقی اور مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہے اور ان کا اشتراکی نظریے کے ساتھ برائے نام تعلق ہے۔ البتہ اپنے ملک کی ریاستی خودمختاری اور سالمیت کے بارے میں چینی بہت حساس ہیں اور وہ سنکیانگ، تبت اور تائیوان کو چین کا اٹوٹ انگ سمجھتے ہیں۔

س: اکیسویں صدی میں امریکہ کے گلوبل امپریل ازم کے خلاف چین و جاپان اور مسلم ممالک میں مفاہمت کے کیا امکانات ہیں اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے؟

ج: جاپان میں میری یہ کوشش رہی کہ میں جاپانیوں کے ذہن میں یہ بات ڈال سکوں کہ امریکہ کی یہ کوشش ہوگی کہ جاپان کو بھارت کا ٹکنالوجیکل اور مالیاتی پشتی بان بنا دے اور اس طرح دونوں کو ملا کر چین کے مقابلے میں کھڑا کر دے۔ اسی لیے وہ پاکستان کو بھی دباؤ میں لاکر بھارت کی بالادستی قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ ایشیائی کو ایشیائی کے مقابلے میں کھڑا کر کے گلوبل امپریل ازم قائم کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہونے کے بجائے اگر جاپان اور چین کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو جائیں اور یہ دونوں ممالک مسلم ممالک کے ساتھ بھی گہرا قریبی تعلق قائم کرلیں تو دنیا کو عدل و انصاف پر مبنی ایک صورت حال مل سکتی ہے جس کے ذریعے سے انسانی آبادی کسی نئے امپریل ازم سے بچ سکتی ہے۔ چین اور جاپان کے درمیان باہمی اعتماد کی کمی اس میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جاپان کو امریکہ نے مکمل طور پر اپنا تابع بنایا ہوا ہے۔ اس کو ایٹمی چھتری فراہم کی ہے اور اس کو چین اور شمالی کوریا کے ایٹمی اور روس کے فوجی تسلط سے بچانے کی ضمانت فراہم کر رکھی ہے۔ اس کے بدلے میں امریکہ نے جاپان کی خارجہ پالیسی کو مکمل طور اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔

جاپان میں لوگوں نے میرے ساتھ ہر ملاقات میں پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ اس بات سے وہ انکار نہیں کرتے کہ جنگ عظیم دوم میں جاپان کے پاس نیوکلیئر طاقت ہوتی تو امریکہ اس پر ایٹم بم نہ گراتا۔ انھیں اچھی طرح اس بات کا احساس ہے کہ جاپان کو جرم ضعیفی کی سزا دی گئی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ آج تک جاپانی نہیں سمجھ سکے کہ انھیں کیوں وحشیانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ جو وجوہات بیان کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ امریکہ کو یہ خدشہ تھا کہ اس نے جلد جاپان پر قبضہ نہ کیا تو روس جاپان پر قبضے کے لیے پیش قدمی کر سکتا ہے۔ اس حملے کا ایک مقصد یہ تھا کہ مستقبل کے دشمن روس کو بتا دیں کہ ان کے پاس یہ وحشیانہ ہتھیار موجود ہیں۔ جاپانی بہ ظاہر ایٹم بم سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ فیصلہ کرلیں تو ایک ہفتے کے اندر اندر ایٹم بم بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے پوری تیاری کر

رکھی ہے۔ وہاں ایسی سیاسی لابی بھی موجود ہے جس کا خیال ہے کہ وہ چین' امریکہ' روس اور شمالی کوریا کی بڑی ایٹمی طاقتوں کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور ایک بہت بڑی مالیاتی اور ٹکنالوجیکل طاقت ہونے کی وجہ سے وہ ان عالمی قوتوں کے حسد کا بھی نشانہ بنے ہوئے ہیں' اس لیے ان کو کسی وقت اپنے دستور میں ترمیم کر کے اپنی دفاعی ضروریات کے مطابق بجٹ میں اضافہ کرنے اور ایٹمی طاقت بننے کا اعلان کرنا پڑے گا۔

جاپان کے ساتھ مسلسل رابطہ قائم کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکی پلان کے زیر اثر چین کے مقابلے میں محاذ آرائی کی بجائے ان کے لیے زیادہ بہتر' مثبت اور باوقار عالمی رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آزادانہ پالیسی اختیار کر کے پاکستان' وسط ایشیا اور دوسرے ممالک کی ٹکنالوجیکل ترقی کا ذریعہ بنے اور اس طرح عالمی طاقتوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کا موثر کردار ادا کرے۔ یہ مستقبل کی عالمی سیاسی صورت گری کرنے والوں کے لیے ایک اہم موضوع ہے جس پر پاکستان اور دیگر مسلمان ممالک کے دانش وروں کو کام کرنا چاہیے۔

س : ان معاشروں کی وہ اچھی باتیں کیا ہیں جو ہم قومی اور تحریکی سطح پر اختیار کر سکتے ہیں؟

ج : جاپانی معاشرے کی سب سے اچھی خوبی اس کی قومی سوچ ہے۔ جاپانی قومی سوچ رکھتے ہیں۔ اپنی ذات کی بجائے وہ ہمیشہ قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ منصوبہ بندی جاپانیوں کی عادت ہے۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں منصوبہ بندی' قومی منصوبہ بندی کا حصہ ہوتی ہے۔ ہر جاپانی دوسرے جاپانی پر مکمل اعتماد کرتا ہے اور ان کی منصوبہ بندی اتنی تفصیلی' ٹھیک اور درست ہوتی ہے کہ اگر آپ نے ریلوے کے کسی ڈبے میں ریزرویشن کرائی ہے تو ریلوے اسٹیشن پر آپ کے کھڑے ہونے کا مقام بھی اس ریزرویشن میں لکھا ہوتا ہے اور اس مقام کی نشان دہی ریلوے اسٹیشن پر کی گئی ہوتی ہے۔ آپ نے جا کر صحیح اس جگہ پر کھڑا ہونا ہوتا ہے اور بلٹ ٹرین ۵ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہوئے اس انداز سے اسٹیشن پر آکر رکتی ہے کہ آپ کے ڈبے کا دروازہ آپ کے سامنے آکر رکے گا۔

۱۰ کروڑ کی آبادی کو مکمل طور پر تعلیم دی گئی ہے۔ ۹۹.۸ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ نو سال کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۹۰ فی صد طلبہ ثانوی تعلیم میں داخلہ لیتے ہیں اور وہاں سے فارغ ہونے والی ۶۰ فی صد تعداد یونی ورسٹی میں داخلہ لیتی ہے۔ ساری قوم کو پوری طرح سے علم سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تعلیم ہی ان کا بنیادی وسیلہ ہے۔ ایک جاپانی پروفیسر ہیراشیما نے جو چار سال تک لاہور میں رہے ہیں' مجھ سے کہا کہ پاکستان کے خلاف گہری سازش کی گئی ہے کہ اس کی محنتی' ذہین اور محب وطن قوم کو علم سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ استعماری سازش کا نتیجہ ہے اور اس میں جاگیرداروں نے استعمار کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا ہے۔ جاپان نے اسی تنظیم' علم اور ٹکنالوجی سے مسلح کرنے کے نتیجے میں پوری آبادی کو کام پر لگا رکھا ہے۔ جاپان میں کپاس نہیں ہوتی لیکن وہ کپڑے کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ جاپان میں پٹرول باہر

سے درآمد ہوتا ہے لیکن وہ گاڑیوں کا سب سے بڑا مینوفیکچرر اور برآمد کنندہ ہے۔ جاپان میں لوہا باہر سے درآمد کرتا ہے لیکن اس کی مشینری پوری دنیا میں جاتی ہے اور وہ اس کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ہے۔ اس کا علم اور ہنر ہی اس کی طاقت کا راز ہے۔ یہی منصوبہ بندی سیکھنا ہمارا فرض ہے۔ چین بھی کم و بیش اسی راستے پر گامزن ہے۔

تحریکی سطح پر ہمیں جاپان اور چین کی اصلاحی تحریکوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ چینی لیڈروں نے ذاتی قربانی دے کر اور مثال قائم کر کے اپنی پوری قوم کو بے غرض اور بے لوث جدوجہد پر آمادہ کیا ہے۔ رضاکار اساتذہ اور ڈاکٹروں کی بڑی بڑی ٹیمیں منظم کی گئی ہیں اور لوگوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعلیم کو مال بنانے کا ذریعہ بنانے کے بجائے خدمت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ جاپان میں اس وقت بھی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے اور نصاب اور درسی کتب پر تحقیق کے ادارے موجود ہیں جو اس میں مسلسل اصلاح کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چین اور جاپان کی تنظیم اور ترقی کا راز ان کی اصلاحی تنظیموں کا مرہون منت ہے۔ کسی بھی قوم کی تاریخ پڑھ لیں، کبھی بھی اوپر سے مسلط کی گئی قیادت ترقی و اصلاح میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکی بلکہ ہمیشہ تبدیلی اور انقلاب سے پہلے مصلحین قوم کے اندر بیداری پیدا کرتے ہیں۔ بیداری پیدا کرنے کے نتیجے میں ایک تحریک اٹھتی ہے۔ تحریک کے مخلص، بے لوث کارکنوں کے ہاتھ میں جب اختیارات آتے ہیں تو وہ پوری قوم کو ترقی اور عروج کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دو بڑے مصلحین علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ نے قوم کو یہی درس دیا۔ پوری قوم کا فرض ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں ان مصلحین کی آرا اور کوششوں کے مطابق اپنے آپ کو منظم کریں اور عروج کے راستے پر گامزن ہوں۔

ہمارے پاس اللہ کی دی ہوئی رہنمائی موجود ہے اور ہم اللہ کے آخری پیغام کے حامل اور علم بردار ہیں۔ اگر ہم اس کی روشنی میں اپنا سفر طے کریں گے تو ہم نہ صرف اپنے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کما سکتے ہیں بلکہ مادی ترقی کے باوجود دنیا جس طرح عالمی سطح پر مضطرب ہے اسے بھی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی سکون کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ دنیا و آخرت کی بھلائی کے اس راستے پر گامزن ہونے کے لیے آہنگ کو بلند کرنے اور قدم کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

نئی مطبوعات

۱۔ اسلامی جامعات	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۲۔ حرمین الشریفین اور تبرکات نبویؐ	علی اصغر چوہدری
۳۔ سائنس خدا کے حضور میں	پروفیسر راؤ مختار احمد
۴۔ ذوالجلال والاکرام	شاہدہ ناز قاضی
۵۔ شعلہء گفتار	محمد منیر افضل
۶۔ تفہیم القرآن کی تمثیلات و تشبیہات	ڈاکٹر محمد جنید
۷۔ تسہیل القرآن	میر محمد حسین
۸۔ قرآنی سورتوں کے موضوعات و مرکزی مضامین	امیر محمد حسین
۹۔ سیرت نبویؐ میں عورت کا کردار	پروفیسر عاصمہ فرحت
۱۰۔ امریکہ میں مسلمان اور ان کی قیادت	ابراہیم ہمدانی
۱۱۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات	عرفان حسن صدیقی
۱۲۔ احکام الٰہی	مرزا جاوید اقبال
۱۳۔ دعوت ایمان	محمد ندیم اعظم
۱۴۔ تفہیم الاسلام (نہم، دہم)	
۱۵۔ جدید ترکی میں اسلامی بیداری	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
۱۶۔ عالم عرب پر مشنری یلغار	ظہیر الدین بھٹی (مترجم)
۱۷۔ اسلام جدید دور میں	سلمان حسین خان

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فون : 7664504-7669546 فیکس : 7658674

e-mail: islamic@ms.net.pk

شوروم : ۱۰- چیمبرلین روڈ، اردو بازار لاہور۔ فون : 7248676

کام سونپ کر کام کروانا

اجتماعی زندگی میں کچھ کام انسان خود کرتا ہے اور کچھ دوسروں سے کرواتا ہے ...... دوسروں سے کام کروانا خود کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اصل مسائل یہیں پیدا ہوتے ہیں۔

ان تدابیر کو اختیار کرنے سے توقعات اور حقائق کے فاصلے کو کم کیا جاسکتا ہے۔

① **مطلوب کی وضاحت:** کیا نتائج چاہئیں؟ کیا ضروری ہیں؟ کیا زائد ہیں؟ معیار کیا ہو؟ وقت، مقام، موقع کیا ہو؟

② **طریقہ کار پر رہنمائی:** کیا انداز بہتر ہے؟ کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟ مشکلات کیا پیش آسکتی ہیں؟ غیر یقینی امور کیا ہیں؟ متبادل صورتیں؟

③ **وسائل کی فراہمی:** کم از کم وسائل کی دستیابی کا امکان کیا ہے؟ وسائل نہ ملے تو کیا ہو؟ وسائل کے استعمال کی ہدایات۔

④ **ذمہ داری کا تعین:** کام ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں رد عمل کیا ہو گا؟ ذمہ دار کون ہو گا؟

⑤ **کام کے دوران باخبری:** جب فرد کام کر رہا ہو تو باخبر رہنا ازحد ضروری ہے تاکہ مرحلہ بہ مرحلہ تبدیلیوں سے آگاہی رہے اور نتائج کو یقینی بنایا جا سکے۔

یہ تدابیر اس وقت کارگر ہیں جب آپ کسی اہل فرد کو کام سونپیں۔

کام کرنے والا اگر نااہل ہے تو یہ بات آپ کی اہلیت کو مشتبہ بنا دیتی ہے۔ پھر کام نہ ہونے کی کلی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔

”اتاترک“

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

”۶۰ سال پہلے“ کے انتخاب کے لیے' ترجمان القرآن کی ورق گردانی کرتے ہوئے' اتاترک نامی ایک کتاب پر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ پاکستان کے موجودہ چیف ایگزیکٹو کی زبان سے' غالباً ان کی ترکی میں تعلیم کے حوالے سے' اتاترک کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ اس پس منظر میں' مناسب معلوم ہوا کہ اس دور کے قارئین کے لیے یہ تبصرہ دوبارہ شائع کیا جائے۔ جناب محمد مرزا صاحب دہلوی کی ۲۸۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۶۰ سال پہلے دو روپے تھی۔ (مدیر)

مصنف نے ازراہ انکسار اس کتاب کو اتاترک کی سوانح عمری قرار دیا ہے لیکن اگر وہ اسے ”قصیدۂ نعتیہ درشان اتاترک علیہ السلام“ کے نام سے موسوم کرتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ترکی میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا جو تمام ممکن التصور کمالات کا مجموعہ' جملہ عیوب و نقائص سے منزہ' اور بڑی حد تک فوق البشری قوتوں سے مسلح تھا۔ زندگی بھر اس نے جو کچھ کیا خوب ہی کیا' قسم کھانے کو بھی کہیں اس سے غلطی سرزد نہ ہوئی' جہاں جس کسی انسان سے بھی اس کا اختلاف ہوا وہاں وہی حق پر تھا اور اس سے اختلاف کرنے والا ہی برسرغلط بلکہ اخلاقی گنہگار تھا' اس کے جن جن افعال پر دنیا میں کہیں کسی وقت نکتہ چینی کی گئی ہے' ان سب میں وہ خطا و لغزش سے پاک نظر آتا ہے اور خطا اگر پائی جاتی ہے تو خود نکتہ چینوں میں نہ کہ حضرت اتاترک میں۔ قصہ مختصر یہ کہ مصنف کے الفاظ میں ”اتاترک کی شخصیت قدیم اور جدید تاریخ میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور ڈھونڈے سے بھی کوئی ان کا مثیل نظر نہیں آتا“۔ صلوا علیہ و آلہ۔

یہ تمام مبالغہ جس شخص کے حق میں کیا گیا ہے اسے مرے ہوئے ابھی کچھ بہت زیادہ دن بھی نہیں گزرے ہیں کہ ماضی کے دھندلکے سے فائدہ اٹھا کر اسے دیوتا بنا ڈالا جائے۔ پرانے زمانے کے مچھر کو آج ہاتھی بنایا جا سکتا ہے مگر ہم عصروں کی آنکھوں میں آپ کہاں تک خاک جھونکیں گے۔ بلاشبہ اتاترک ایک

اچھا جنرل تھا۔ قیادت کی بعض صلاحیتیں بھی اس میں پائی جاتی تھیں۔ سیاسی تدبر بھی ایک حد تک اس میں موجود تھا۔ اس کی رہنمائی میں ایک شکست خوردہ قوم تباہی سے بچ گئی اور اس نے اپنے قومی وطن کو پھر سے ایک آزاد سلطنت بنالیا۔ اس کارنامے پر اس کی جتنی چاہیے تعریف کر لیجیے۔ لیکن تہذیبی و تمدنی مسائل میں اس کے علم و بصیرت کا معیار ہمارے کالجوں سے نکلے ہوئے عام "صاحب بہادروں" سے کچھ بھی زیادہ اونچا نہ تھا۔

اپنے ملک کو آزاد کرانے کے بعد جب احسان مند ترکی قوم کو اس نے اپنا گرویدہ پایا تو اسے اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہو گئی کہ میں حکیم بھی ہوں اور ایک نئی قوم کی تعمیر بھی صحیح طور پر کر سکتا ہوں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر اس نے ترکی قوم کی تعمیر جدید کا کام تنہا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس معاملے میں کم از کم اس سے زیادہ علم و بصیرت رکھتے تھے، میدان سے ہٹا دیا۔ اس طرح مختار مطلق بننے کے بعد اس نے جو کچھ کیا، مغربی تہذیب کا ہر مشرقی نقال اس کے سے اختیارات پا کر وہی کرتا۔ کسی مجتہدانہ فکر، کسی قوت انتخاب، کسی صلاحیت تنقید اور کسی آزادانہ اختراعی قابلیت کا اس کے پورے کارنامے میں ادنیٰ سا شائبہ تک نہیں ملتا۔ خیالات، اصول، طریقے، سب ہی چیزیں تو وہ مفلس دماغ کا انسان یورپ سے مانگ لایا اور اپنے ذاتی اجتہاد سے ذرہ برابر کام لیے بغیر جوں کا توں اپنی قوم کے سر منڈھتا چلا گیا۔ اس بیچارے میں اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ یورپ کے اسباب عروج اور اسباب تنزل میں فرق کرتا۔ عام سطحی النظر لوگوں کی طرح اس نے بھی یہی سمجھا کہ برسر عروج قوموں کی ہر چیز اچھی۔ چنانچہ وہ مفید چیزوں کے ساتھ ایسی بیماریاں بھی ترکی میں لے آیا جن کی وجہ سے خود یورپ کی زندگی آج تباہ ہو رہی ہے۔

یہ کون سا ایسا بڑا کارنامہ ہے جس کی بنا پر اس شخص کو آسمان پر چڑھایا جاتا ہے؟ دنیا کے تہذیبی معماروں کی صف اول میں تو درکنار وہ غریب تو ان کی صف آخر میں بھی جگہ پانے کے قابل نہیں۔ ایک کاپی نویس کی آپ اس حیثیت سے جتنی چاہیے تعریف کر لیجیے کہ بہت صحیح نقل کرتا ہے اور نقل و اصل میں ذرا فرق باقی نہیں رہنے دیتا۔ مگر کیا انشا پردازوں کی مجلس میں اس کو دہلیز پر بھی کھڑے ہونے کی جگہ مل سکتی ہے؟ ہم یورپ کے ان ناخدا شناس مفکرین کی قدر کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنے زور طبع سے کسی نئے نظام فکر و مذہب عمل کی بنا رکھی۔ مگر اتاترک اور رضائے پہلوی جیسے تھرڈ کلاس آدمیوں کی ہم کیا قدر کریں جن کی پوری زندگی سے ایک اجتہادی کارنامہ بھی نکال کر نہیں بتایا جا سکتا۔

اتاترک کی مبالغہ آمیز تعریف سے تو مصنف نے صرف اتنا ہی ظاہر کیا تھا کہ ان کا معیار کمال انسانی کتنا بلند ہے، مگر جہاں انھوں نے اپنے ممدوح کو مسلمان اور وہ بھی پکا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں یہ راز بھی فاش ہو گیا کہ ماشاء اللہ ان کو اضداد کے جمع کرنے میں بھی پورا کمال حاصل ہے۔ دیباچے

میں جب ہم نے ان کے یہ الفاظ پڑھے کہ ''اتاترک کے الحاد و بے دینی کے افسانے'' یورپ کی خبر رساں ایجنسیوں کے پھیلائے ہوئے ہیں اور ہندستان کے ''قدامت پرستوں'' کا گروہ محض مغربی پروپیگنڈے کا شکار ہوگیا ہے تو ہمیں توقع ہوئی کہ آگے چل کر شاید کچھ اتاترک کے مسلمان ہونے کی ایسی شہادتیں پیش کی جائیں گی جو اس پروپیگنڈے کی پوری طرح تردید کر کے اس کی دین داری ثابت کر دیں گی۔ مگر جب اس بحث کا موقع آیا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فاضل مصنف نے انھی تمام چیزوں سے اتاترک کے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا ہے جو دراصل اس شخص کے نامسلمان ہونے کا ثبوت ہیں۔

وہ خود تسلیم فرماتے ہیں کہ اتاترک نے اسلامی قانون ترکی قلمرو سے یک قلم منسوخ کر کے جرمنی کا تجارتی قانون، اٹلی کا فوجداری قانون اور سوئٹزرلینڈ کا دیوانی قانون جاری کیا۔ وراثت میں عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا۔ تعدد ازواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا۔ مصوری، بت تراشی اور موسیقی کے معاملے میں وہ ''مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر کے قائل نہ تھے'' اور ''ترکوں کے دماغوں سے اس مذہبی خیال کو محو کرنے کے لیے'' انھوں نے خود اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بت بنوا کر انقرہ، سمرنا اور قسطنطنیہ میں شاہراہوں پر نصب کرائے، مصوری کے اسکول اور کالج قائم کیے، اور مہذب اقوام کے مختلف طرز کے رقص رائج کیے۔ ''ترقی نسواں'' کے سلسلے میں انھوں نے پردے کا کلی استیصال کیا اور ترکی عورتوں کو آزادی کے ٹھیک اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا جس پر ان کی مغربی بہنیں اس وقت کھڑی ہیں۔

ان سب واقعات کو بیان فرمانے کے بعد جناب مصنف پھر اپنی اس شکایت کو دہراتے ہیں کہ ''ان انقلابی اصلاحات کے نفاذ سے یورپ کی بعض حریف قوتوں کو ترکی جمہوریہ اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف، بے دینی اور لامذہبی کے پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آگیا'' اور یہ کہ ''اس غلط پروپیگنڈے سے اسلامی ممالک میں غازی پاشا اور ان کی حکومت کے خلاف عام طور پر بدظنی سی پیدا ہوگئی''۔ سبحان اللہ! قرآن کے صریح احکام سے بغاوت، اسلامی قانون کی مکمل تنسیخ اور اسلام کے اصول تہذیب و تمدن سے کلی انحراف کے بعد بھی بے دینی و لامذہبی کا قصہ صرف ''غلط پروپیگنڈا'' ہی رہا اور ان حرکات سے مسلمانوں نے جو کچھ نتیجہ نکالا اس کی حقیقت ''بدظنی'' سے زیادہ کچھ نہ نکلی۔

فاضل مصنف جس امت سے تعلق رکھتے ہیں اس کی زبان میں ہر ''تغیر'' کا نام ''اصلاح'' ہے۔ قرآن نے جو قانون پیش کیا ہے اس کو بدل ڈالنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی تہذیب کے اصولوں کو منسوخ کر دینا بھی ان لوگوں کے نزدیک ''اصلاح'' ہی کی تعریف میں آتا ہے۔ ان کو ایسی رائے رکھنے کا پورا حق ہے اور ہم اس حق کو ان سے سلب نہیں کر سکتے۔ مگر ہمیں اعتراض جس چیز پر ہے وہ صرف یہ ہے کہ آخر یہ لوگ متضاد باتیں کیوں کرتے ہیں۔ مسولینی نے اشتراکیت کو رد کر دیا اور اس کی جگہ

فاشزم اختیار کر لیا۔ ہر صاحب عقل آدمی اس واقعے کو بطور ایک واقعہ کے تسلیم کرے گا اور کہہ دے گا کہ مسولینی اشتراکی نہیں رہا بلکہ فاشسٹ ہو گیا۔ ایک مسلک سے ارتداد کے بعد بھی کسی شخص کو کھینچ تان کر اسی مسلک کا پیرو ثابت کرنا ظاہر ہے کہ کسی صحیح الدماغ آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ ہمارے ہاں "غیر مسلم مسلمانوں" کا ایک عجیب الخلقت گروہ پیدا ہو رہا ہے جو اسلام کے نظام فکر اور اس کے اساسی قانون سے بغاوت کر کے ایک دوسرے نظام فکر و قانون حیات کو علانیہ قبول کر لیتا ہے اور پھر اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ ہم اس رد و قبول کے بعد بھی ویسے ہی مسلمان ہیں جیسے اس حادثے سے پہلے تھے۔ کیا یہ تناقض بیان کسی ذہنی الجھاؤ کی وجہ سے ہے' یا ان لوگوں میں ابھی اتنی قدامت پرستی باقی ہے کہ ایک پرانا فرسودہ نام جو باپ دادا کے وقتوں سے چلا آ رہا ہے اس کو کسی حال میں یہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے؟

یہ تبصرہ کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے مگر مصنف کے چند "شاہکار" فقروں کی زیارت سے ناظرین کو محروم رکھنا ظلم سے کم نہ ہو گا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> وہ ترکی آداب و معاشرت اور رسم و رواج تک میں مانگے تانگے کا کوئی حقیر جز بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ترکی زبان تک کو بھی' جس میں صدیوں سے ایرانی اور عربی زبانوں کے بیشتر الفاظ گھل مل چکے تھے اور الفاظ بھی ایسے جن کے بدل ترکی زبان میں نہ مل سکتے تھے' غازی پاشا نے غیر ملکی الفاظ سے پاک کر دیا۔

خط کشیدہ فقرے کی تشریح میں اگر لگے ہاتھوں یہ بھی ثابت کر دیا جاتا کہ ہیٹ اور لاطینی رسم الخط دراصل ترکوں سے یورپ والے مانگ لے گئے ہیں' تجارتی' فوجداری اور دیوانی قوانین دراصل ترکی میں بنے تھے جنھیں اٹلی' جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے لوگ لے اڑے اور انقرہ کی عمارات جس طرز تعمیر پر بنی ہیں وہ ترک اپنے ساتھ وسط ایشیا سے لائے تھے' تو یہ ایسا تاریخی انکشاف ہوتا جس پر ساری دنیا انگشت بدنداں رہ جاتی۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

> ترک ایک نئی قوم بن گئے۔ نئے نئے حوصلے اور نئے نئے ارادے ان میں پیدا ہو گئے۔ مغربی تمدن کا طلسم ٹوٹ چکا اور اسی کے ساتھ یورپ سے ان کی وہ مرعوبیت بھی رخصت ہوئی جو صدیوں سے ان کے دلوں میں گھر کیے ہوئے تھی۔

دنیا میں آج تک جتنے طلسم ٹوٹے ہیں ان میں اس طلسم کا ٹوٹنا بس آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ ظالم کچھ اس طرح ٹوٹا کہ پورے ملک میں اب وہی وہ نظر آتا ہے۔ اس نرالی قسم کی شکست نے تو لغت میں "طلسم ٹوٹنے" کا مفہوم ہی بدل ڈالا۔ اور یہ مرعوبیت کے رخصت ہونے کا معاملہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ بکری میں

اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ بکری رہتے ہوئے بھیڑیئے سے نہ ڈرتی۔ اب اس نے بھیڑیئے کی کھال اوڑھ لی ہے اور اپنی چال، آواز، ہر چیز میں بھیڑیوں کی نقل اتار رہی ہے تاکہ بھیڑیئے اسے اپنا ہم جنس سمجھ کر چھوڑ دیں۔ ہم تو خدا سے چاہتے ہیں کہ بیچاری اسی چال کی بدولت جیتی رہ جائے، مگر مشکل یہ ہے کہ سابقہ ان گرگان باراں دیدہ سے ہے جو اپنی جنس کے بہت سے بھیڑیوں کو پھاڑ چکے ہیں۔ کاش اس جاہل اتاترک نے قرآن اور سیرت محمدیؐ کا مطالعہ کیا ہوتا اور ترکی قوم پرستی کے بجائے اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ترکی جدید کی تعمیر کی ہوتی! اس کو اگر معلوم ہوتا کہ ایک محدود قومیت کی طاقت اور ایک عالم گیر تبلیغی مسلک کی طاقت میں کتنا عظیم تفاوت ہوتا ہے، تو وہ اپنی قوم کو پولینڈ، ہالینڈ اور بلجیم کی سی پوزیشن میں چھوڑ کر نہ جاتا بلکہ روسی اشتراکیت سے بیس گنی زیادہ زبردست طاقت کے ساتھ چھوڑتا۔

مصنف کا سب سے زیادہ دلچسپ فقرہ یہ ہے اور بس اسی پر خاتمہ کلام ہے:

> انھوں نے مذہب کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی خود ساختہ اجارہ واری کو ختم کر دیا۔ امتداد زمانہ کے باعث توہمات نے جو اعتقادات کی صورت اختیار کر لی تھی انھیں دور کر دیا..... مذہب اسلام کے متعلق اتاترک کا نظریہ یہ تھا کہ مذہب تمدنی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں بلکہ دنیا کے سارے مذاہب میں صرف مذہب اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں دنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کے وجود سے پیدا ہو گئی ہے..... اسی خیال کے ماتحت ترکی سرزمین کو اتاترک نے ملاؤں اور درویشوں کے وجود سے پاک کیا اور ترکوں کو مذہب اسلام کی اصلی روح سے مانوس ہونے کا موقع دیا اور فی الحقیقت اتاترک کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

شان دار مگر بے معنی الفاظ کا کتنا عجیب مجموعہ ہے! ان لوگوں کے لچک دار اسلام کی کیا تعریف کی جائے، اس کم بخت میں اس غضب کی لچک موجود ہے کہ دنیاوی "ترقیوں" کی خاطر قرآن کا قانون منسوخ کر دینے تک کی گنجایش اس میں نکل آتی ہے۔ اور اس "مذہب اسلام کی اصلی روح" کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ ملا اور درویش کو سامنے رکھ کر اس طرح ڈائنامائیٹ سے اڑایئے کہ قرآن و سنت بھی ساتھ ساتھ اڑ جائیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہے، اس کا نام "خالص روح اسلام" ہے! (مطبوعات، ترجمان القرآن، ابوالاعلیٰ مودودیؒ، جلد ۱۶، عدد ۳-۴، ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر ۵۹ ۱۳ھ، مئی و جون ۱۹۴۰ء، ص ۳۲۲-۳۲۷)۔

"اسلوب دعوت، قرآن و سیرتؐ کی روشنی میں" سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی دوسری قسط آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمایئے۔ (ادارہ)

اباحی معاشرے کے لیے عالمی کوششیں

عنایت اللہ اسماعیل

اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسف (UNICEF) کی ڈپٹی ڈائریکٹر مارجری نوبلین نے حال ہی میں اپنے ادارے کی ایک رپورٹ جاری کرتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ نئی صدی میں "ایڈز" کا مرض سب سے زیادہ اہمیت کے عوامل میں سے نمایاں ترین ہو گا۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں ہر سال ساڑھے ۸ لاکھ بچے اور نوجوان ایچ آئی وی وائرس کا شکار ہو جاتے ہیں جب کہ ڈھائی لاکھ عورتیں ایڈز کے مرض میں ہلاک ہو جاتی ہیں۔

گذشتہ دنوں یونیسف اور ایک غیر سرکاری تنظیم میسیج کے زیر اہتمام مدینۃ الاولیا ملتان کے کلمہ چوک میں ایڈز کے خلاف ایک مظاہرہ منعقد کیا گیا۔ اس کی تصویر میں درجنوں معصوم بچے ہاتھ بلند کیے غالبا ایڈز کے خلاف نعرے لگاتے اور ایک بڑا بینر تھامے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس بینر پر درج ہے "کنڈوم کا استعمال' ایڈز سے بچاؤ"۔ روزنامہ نوائے وقت نے یہ تصویر "ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں" کے عنوان سے شائع کی (۲ دسمبر ۱۹۹۹ء)۔

یہ تصویر دیکھ کر ایک عام قاری کے ذہن میں پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ ان معصوم اور نابالغ بچوں کا "کنڈوم" جیسی "بالغ" شے سے آخر کیا تعلق بنتا ہے؟ اور یہ مذکورہ تنظیم میسیج ان بچوں کو استعمال کرتے ہوئے آخر کیا "میسیج" عوام کو دینا چاہتی ہے؟

بچوں کو استعمال کرتے ہوئے اس طرح کا مظاہرہ کسی غلطی کا نتیجہ قطعاً نہیں ہے۔ بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت ہے۔ یہ منصوبہ بندی کیا ہے؟ اور کہاں انجام پائی ہے؟ اس کو جاننے کے لیے ذرا چند برس پیچھے جانا' اور مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے امریکی اور مغربی معاشروں کی موجودہ صورت حال کا تفصیلی جائزہ لینا ہو گا۔ چین کے دارالحکومت بیجنگ میں ۱۶ ستمبر ۱۹۹۵ء کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام خواتین کی ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد "عورت کے بنیادی حقوق کا تحفظ" تھا۔ مذکورہ کانفرنس میں بڑے اہم اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے کیے گئے جن کی حمایت اور مخالفت کی

صدائے بازگشت اس زمانے میں تمام عالمی نشریاتی اداروں اور پرنٹ میڈیا میں بڑے زور شور سے سنی گئی تھی۔ اقوام متحدہ کے زیراہتمام منعقدہ اس کانفرنس کا اصل مقصد دراصل مغرب کے سیکولر نظریات کو بڑے وسیع پیمانے پر فروغ دینا اور خصوصاً اسلامی ممالک کے مسلم عوام تک ان کو پہنچانا اور قابل قبول بنانا تھا۔ یہ سیکولر عمرانی نظریات دراصل فرد اور معاشرے کو ہر طرح کی دینی اور اخلاقی اقدار کی گرفت سے آزاد کر کے بے لگام آزادی کی راہ پر گامزن کرنے کا دوسرا نام ہیں۔

بیجنگ کانفرنس کے اساسی ایجنڈے میں ضبط تولید کی آزادی، خواتین کو اسقاط حمل کی اجازت، ہم جنس پرستی کو قانونی حیثیت دینے اور خواتین کو مسلمہ مذہبی ومعاشرتی روایات کے علی الرغم بے محابا آزادی دینے کے معاملات شامل تھے۔ ان نکات کے خلاف اس زمانے میں پوری دنیا میں ویٹی کن سمیت مختلف اسلامی تنظیموں کی جانب سے شدید مخالفانہ ردعمل سامنے آیا تھا۔ ویٹی کن کے ترجمان فادر جوکوئن ناوررو والف نے مذکورہ کانفرنس کے ذریعے انسانی حقوق کی عظیم روایات کے ستونوں کو ڈھائے جانے کا الزام عائد کرتے ہوئے ضبط تولید اور اسقاط حمل کے معاملات پر ویٹی کن کی جانب سے برہمی اور ناراضی کا اعلان کیا تھا۔ مسلم دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری تنظیم "مسلم ورلڈ لیگ" کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر احمد محمد علی نے سعودی عرب میں ایک اخبار کو دیے گئے انٹرویو میں اقوام متحدہ پر یہ الزام لگایا تھا کہ مغربی طاقتیں اس ادارے کے ذریعے اپنے نظریات کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کانفرنس میں مذہب اور ثقافت کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ پاکستانی وفد کی سربراہ محترمہ سلمٰی وحید نے کانفرنس میں جنس سے متعلق سفارشات کے خلاف اپنی ناپسندیدگی اور تحفظات کا دوٹوک انداز میں اظہار کیا تھا۔

یہ بات اب بالکل واضح ہے کہ قاہرہ میں ستمبر ۱۹۹۴ء میں ہونے والی عالمی بہبود آبادی کانفرنس ہو یا بیجنگ کی مذکورہ خواتین عالمی کانفرنس، ان کا واحد مقصد مغرب کی اس بگڑی ہوئی بے لگام تہذیب کو (جس کو اگر کنڈوم کلچر کا نام دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا) دنیا کے غریب، پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک خصوصاً اسلامی بلاک کے عوام پر مسلط کرنا ہے۔ اس تہذیب نے خود ان ترقی یافتہ مغربی ممالک کو، خاندانی نظام کی تباہی، فرد اور معاشرے میں انفرادی و اجتماعی بگاڑ، بے چینی اور بنیادی مذہبی اخلاقیات کی تباہی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ ۱۹۹۵ء کے شروع میں امریکہ کی خاتون اول مسز ہلری کلنٹن نے پاکستان کے تفصیلی دورے کے موقع پر اسلام آباد میں ایک کالج کی طالبات سے گفتگو کے دوران بذات خود مغربی تہذیب کی ایک بنیادی خرابی کی جانب بڑی جرأت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "امریکہ کی نوجوان لڑکیوں کا سب سے بڑا مسئلہ قانونی طور پر منعقدہ شادی سے قبل ہی ان کا ماں بن جانا ہے" (روزنامہ جنگ، ۲۵ مارچ ۱۹۹۵ء)۔

مسز کلنٹن نے اس ایک جملے کے ذریعے پورے مغربی اور امریکی معاشرے کی ایک سچی تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔ انھوں نے اس موقع پر بڑے واضح الفاظ میں مزید کہا تھا کہ "چونکہ پاکستان میں مذہبی روایات کا احترام ابھی تک موجود ہے اس لیے یہاں مسائل بھی کم ہیں اور جو ہیں وہ دراصل خواندگی کی شرح کے انتہائی کم ہونے کے سبب پائے جاتے ہیں"۔ علاوہ ازیں انھوں نے نوجوانوں کو یہ صائب مشورہ بھی دیا تھا کہ خواہ وہ مسلم ہوں یا عیسائی' اپنی مذہبی و سماجی روایات اور اصولوں سے بغاوت نہ کریں بلکہ انھی کے تحت شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔ نیز اپنی اور والدین کی عزت و آبرو اور سکون کو غارت نہ کریں۔

مسز کلنٹن نے مغربی تہذیب کی جس بنیادی خرابی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ بے لگام جنسی آزادی پر مغربی معاشروں میں کسی قانونی' اخلاقی اور مذہبی قدغن کا بالفعل موجود نہ ہونا ہے۔ اسی کے سبب مغربی معاشرے تباہی کی جانب تیزی کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ طرفہ تماشا ہے کہ انھی خرابیوں کے مجموعے پر مشتمل مغربی معاشرتی اقدار کو پوری دنیا پر نافذ کر دینے کا مطالبہ بھی خواتین ہی کی جانب سے بیجنگ کانفرنس میں سامنے لایا گیا۔ مغربی تہذیب و تمدن میں آج خواتین تمام تر آزادی عمل رکھنے کے باوجود سب سے زیادہ مظالم کا شکار ہیں۔

مذہب سے راہ فرار حاصل کر کے بے خدا سیکولر نظام میں پناہ حاصل کرنے والی مغربی اقوام تمام تر اقتصادی ترقی کے باوجود آج جس ناگفتہ بہ حالت سے گزر رہی ہیں' آیئے' ذرا اس کا جائزہ خود مغربی پریس ہی میں چھپنے والی مختلف رپورٹوں اور خبروں کے ذریعے لیں۔

امریکہ: امریکہ عالمی نقشے پر روس کی پسپائی کے بعد "یونی پولر قوت" کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ مادی ترقی کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہو جانے کے باوجود معاشرتی سطح پر تباہ حالی کے جس نشان پر امریکہ اس وقت پہنچ چکا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مادی ترقی کے ثمرات سے جہاں امریکہ نے اپنے معاشرے اور فرد کو بے انتہا فیض پہنچایا ہے' انھیں زندگی گزارنے کی ہر طرح کی آسایشیں بہم پہنچائی ہیں' وہیں اس ترقی نے مغربی معاشرے کے خاندانی نظام کو' جو دراصل کسی بھی متمدن معاشرے کی سب سے بنیادی اکائی ہوتا ہے' توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

۱۹۹۳ء میں امریکی حکومت کی جانب سے کیے گئے ایک سروے کے مطابق ایک سال میں امریکہ میں کل ۲۴ لاکھ ۱۲ ہزار شادیاں قانونی طور پر منعقد ہوئیں۔ ۳ ماہ بعد ہی ان میں سے ۲ لاکھ ۹۲ ہزار کا انجام طلاق پر ہوا۔ اس طرح تقریباً ۲۱ فی صد شادیاں ناکام ہوئیں۔ ۷۵ فی صد شادی شدہ مرد اور خواتین اپنے شریک حیات کے ساتھ بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں جو ان شادیوں کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ امریکہ کی کل آبادی میں سے تقریباً دو کروڑ افراد ہم جنس پرستی کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ ۱۲ برس سے لے کر ۱۹ برس تک کی

لڑکیاں جنسی حملوں کا نشانہ بنتی ہیں جن میں اکثر اپنے انتہائی قریب ترین رشتے داروں یعنی بھائی، باپ وغیرہ کی ہوس کا شکار ہوتی ہیں۔ تمام تر احتیاطی تدابیر (جن میں کنڈوم کا استعمال سرفہرست ہے) کے باوجود پیدا ہو جانے والے بچوں میں سے ۶۵ فی صد ناجائز ہوتے ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری حکومت کے سر ہوتی ہے۔ مختلف طرح کے جرائم میں ۱۹۷۳ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیان ۶۶ فی صد اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ ان جرائم میں ملوث افراد میں اکثریت ۲۰ برس کے نوجوانوں کی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں ۱۰ شہروں میں ۵ لاکھ افراد کو جیلوں میں مختلف جرائم کی بنا پر بند کیا گیا۔ مختلف الزامات کے تحت ایک لاکھ ۴۰ ہزار افراد پولیس اسٹیشن پکڑ کر لائے گئے (ہفت روزہ اکانومسٹ، اکتوبر ۱۹۹۴ء)۔ امریکی ہفت روزہ انکوائرر کی ایک رپورٹ کے مطابق گزرے ہوئے سال ۱۹۹۹ء میں تقریباً ۹ لاکھ خواتین کی عصمتیں لوٹی گئیں، جب کہ ان وارداتوں کے ۶۰ فی صد ملزمان گرفتار بھی نہ ہو سکے (روزنامہ امت، ۶ جنوری ۲۰۰۰ء)۔

امریکہ میں بسنے والے ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ سیاہ فام باشندے سیکولر پالیسی کے باوجود نسلی امتیاز کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ۳۲ء۲ ملین امریکی شہری غربت کی انتہائی نچلی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ منشیات کا بے دریغ استعمال کسی بھی طور پر ختم نہیں ہو رہا ہے۔ عریانیت زندگی کا رہن سہن بن چکی ہے۔ امریکی صدر بل کلنٹن امریکی افواج سے ہم جنس پرستی پر عائد پابندی کو ختم کرا چکے ہیں۔ امریکی معاشرے میں موجود ان تمام معاشرتی خرابیوں کے باوجود امریکی حکام، سیاست کار اور پالیسی ساز اس بات پر مصر ہیں کہ اپنے ہاں کی ان تمام خرابیوں کو اپنے زیردست غریب خصوصاً اسلامی ممالک میں پہنچا دیا جائے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت قاہرہ میں ۵ تا ۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ء کو بہبود آبادی کے نام سے ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کا بنیادی ایجنڈا اور اس میں کیے گئے فیصلے ہیں جس کے تحت ترقی پذیر ممالک میں آبادی کے بے انتہا پھیلاؤ کو روکنے کے لیے "کنڈوم کلچر" کو پوری شدومد کے ساتھ فروغ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ قاہرہ کی اس کانفرنس میں خواتین کی بین الاقوامی تنظیموں کی جانب سے بڑا پُرزور مطالبہ یہ آیا تھا کہ اسقاط حمل پر عائد پابندی اٹھائی جائے۔ کانفرنس میں شریک مسلم ممالک اور ویٹی کن کی جانب سے مخالفت کے پیش نظر امریکہ کی نمایندگی کرتے ہوئے امریکہ کے نائب صدر مسٹر ایل گور نے اپنی تقریر میں صرف برتھ کنٹرول کے حق کو تسلیم کرنے پر زور دیا تھا (ہفت روزہ نیوزویک، اکتوبر ۱۹۹۴ء)۔

یورپی ممالک: دوسرے مغربی ممالک کا حال بھی امریکہ سے کچھ مختلف نہیں۔ ذرا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔ ۱۰ فی صد خاندان بغیر باپ کے پائے جاتے ہیں یعنی ناچاقی کے باعث علیحدگی ہو چکی ہے، یا ماں کے سر پر ناجائز بچوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی ہے۔ ۱۵ سال کی عمر تک پہنچ کر اکثر بچے اپنے گھروں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ۱۳ سال کی عمر ہی سے بچوں میں شراب کی لت پڑ جاتی ہے۔ معاشرے کے

صرف ۱۰ فی صد افراد بوجوہ شراب نہیں پیتے۔ خواتین اور بوڑھے رات کے وقت تنہا کہیں جا نہیں سکتے۔ ۷۰ فی صد ایسے لڑکے لڑکیاں تھیں جن کو ان کے محبوب یا منگیتروں نے موت کے گھاٹ اتارا۔ میاں بیوی کے تعلقات کچے دھاگوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر طلاق پر منتج ہوتے ہیں۔

معاشرے کا ہر فرد اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ پارکوں میں جابجا بوڑھے لوگ الگ الگ اکیلے بیٹھے دور خلاؤں میں تکتے نظر آتے ہیں۔ آخر عمر میں بزرگوں کا ٹھکانہ اولڈ ہاؤس ہوتے ہیں جہاں وہ مرتے دم تک صرف اپنے بچوں کی یادوں کو سینے میں بسائے ان سے ملنے کی آرزوئیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ کرسمس کارڈ یا فادرز ڈے اور مدرز ڈے کا مبارکبادی پیغام مل جائے تو ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اسکولوں اور دفاتر کے باتھ رومز میں "کنڈومز" موجود رہتے ہیں تاکہ تعلیم حاصل کرتے وقت یا کام کے دوران "جنسی جذبات" بیدار ہو جائیں تو خواتین و حضرات اور طلبہ و طالبات "محفوظ طریقوں" سے اپنی سفلی خواہشات کی تسکین کر لیں۔ حقوق انسانی کے عالمی نمایندے مسٹر اینڈریو جانسن کی ایک حالیہ سروے رپورٹ کے مطابق آسٹریلیا میں ۶ ہزار سے زائد بچے جن کی عمریں ۱۸ برس سے کم ہیں، اپنے علاج، خوراک، رہایش، شراب اور سگریٹ کے حصول کے لیے اپنا جسم فروخت کرتے ہیں جب کہ وہاں کی حکومت ان کو اس حالت زار سے نکالنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی ہے (روزنامہ نوائے وقت، ۴ جنوری ۲۰۰۰ء)۔

آج مغربی تہذیب جس بھیانک صورت حال سے دوچار ہے اس کی بنیادی وجہ اللہ اور اس کے رسولوں کی جانب سے آئی ہوئی ہدایات سے واضح طور پر انحراف برتنا ہے۔ اس تہذیب و تمدن کی بنیاد دراصل انسان کی لامحدود مادی خواہشات کی ہر ممکن طور پر تکمیل اور حیوانی لذت کے حصول پر رکھی گئی ہے۔ مغربی معاشی مفکروں اور نظریہ سازوں نے ان ہی دونوں خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے معاشی و معاشرتی نظریات وضع کیے۔ ادیبوں، شاعروں اور رائے عامہ تشکیل دینے والے ماہرین اور ذرائع ابلاغ کے جادوگروں نے عوام کے ذہن تیار کیے۔ مقننہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روشن ہدایات کے برخلاف قوانین اور اصول و ضوابط تیار اور منظور کیے اور عدلیہ نے ان کا تحفظ کیا۔ مغربی معاشرے میں پایا جانے والا اخلاقی انحطاط دراصل اللہ سے بغاوت کی اسی طویل روش کا شاخسانہ ہے جس پر صدیوں سے مغربی و امریکی اقوام عمل پیرا چلی آ رہی ہیں۔ آج مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے عوام کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے مواقع، علاج معالجے کی بہترین سہولتیں، تفریح و مسرت کے وسیع سامان، رہن سہن اور زندگی گزارنے کے لیے اعلیٰ آسایشیں تو بہم پہنچا دی ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یہ اعلیٰ ترقی یافتہ تہذیب ۱۵ سال کی نوخیز بچیوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کا کوئی سامان نہیں کر سکی۔ معصوم نوجوان لڑکوں کو منشیات کا عادی بننے سے

روکنے کی کوئی تدبیر اب تک کامیاب نہیں ہو سکی۔

مغرب نے نہ صرف یسوع مسیحؑ کی سچی تعلیمات سے روگردانی کی بلکہ اسلام کو جو ان کے عیسائی مذہب کی مانند ایک الہامی دین ہے، سمجھنے اور پرکھنے کی اب تک کوئی سنجیدہ کاوش نہیں کی ہے۔ اگر مغرب نے اسلام کا سرسری مطالعہ ہی کیا ہوتا تو اس کے دانش وروں، پالیسی سازوں، صحافیوں اور ادیبوں کو یہ ادراک ضرور ہو گیا ہوتا کہ مغربی اقوام اخلاقی برائیوں کی دلدل میں دھنس کر جس طرح کے نتائج کا سامنا کر رہی ہیں، مسلم امت بہرحال بحیثیت مجموعی ایسے برے حالات سے ابھی دوچار نہیں ہوئی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اسلامی ممالک میں اسلام کے بنیادی اصول و قوانین کا باقاعدہ نفاذ نہ ہونے کے باوجود ان کے عوام میں جو الہامی تصورات، سماجی روایات، اصول و ضوابط صدیوں سے رائج ہیں، ان کی وجہ سے ہمارے معاشرے اپنی تمام تر پسماندگی، معاشی ابتری، جہالت، آبادی کے بے انتہا پھیلاؤ اور دیگر مسائل کے باوجود سکون و اطمینان، خاندانی مسرت و بزرگوں کا احترام، بچوں سے شفقت اور باہمی میل ملاپ جیسے محبت آمیز رویوں سے ابھی تک لطف اندوز ہو رہے ہیں جن کا تصور بھی مغربی معاشرے میں محال ہے۔

عیسائی معاشروں نے حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار ہونے کے باوجود جس طرح اللہ کے اس برگزیدہ انسان کے افکار اور تعلیمات کی خلاف ورزی کی ہے، آج مغربی معاشروں کی اخلاقی بدحالی اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ شراب کا کثرت سے استعمال، زنا کی بلاروک ٹوک اجازت، ہم جنس پرستی کی آزادی، جسم فروشی اور قحبہ گری کو قانونی تحفظ، عریانیت کا بے انتہا پھیلاؤ اور سود پر قائم معاشی نظام--- ان تمام چیزوں کی کیا مسیحؑ کی تعلیمات میں کہیں ذرا سی بھی اجازت ملتی ہے؟ سیکولر نظام نے معاشروں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے ذریعے ترقی کے آسمان پر تو پہنچا دیا مگر ان کی بنیاد میں سے خدا کو باہر نکال کر دراصل ریت پر عظیم الشان محل تعمیر کر دیا ہے۔ یہ عظیم الشان اور روشن محل اب گرا ہی چاہتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مغرب کے دانش ور اور رائے عامہ کے رہنما یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آخر وہ کون سے امور ہیں جن کو اپنا کر مغربی اقوام بھی وہی سکون و اطمینان حاصل کر سکتی ہیں جو ہمیں اپنے اسلامی معاشروں میں حاصل ہیں۔ امریکہ میں جرائم کی روز بروز بڑھتی ہوئی رفتار پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "روحانیت کا فقدان امریکہ کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے" (ہفت روزہ اکانومسٹ، اکتوبر ۱۹۹۶ء)۔

روحانیت کے اس فقدان کے سبب مغربی تہذیب انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو چکی ہے۔ اس گمشدہ روحانیت کی تلاش میں مغربی اقوام کے بے چین اور ناآسودہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں "ہپی ازم" اختیار کر کے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ گو انھوں نے اس گمشدہ سکون کی تلاش میں اپنے آپ کو منشیات کے زہریلے دھوئیں میں گم کر دیا ہے لیکن دنیا کو ایڈز جیسی مہلک اور جان لیوا بیماری کا تحفہ بھی

تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔

جہاں تک ۲۰ ویں صدی کے آخری عشرے کے سب سے بھیانک عفریت یعنی "ایڈز" کا تعلق ہے اس سے بچاؤ "کنڈوم" کلچر کے فروغ سے قطعاً نہیں ہو سکتا۔ یہ مغرب کی محض خام خیالی ہے۔ اس کنڈوم کلچر ہی نے تو انسانیت کو اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ نئی صدی کے دروازے پر ہم اس حالت میں کھڑے ہیں کہ اپنی تمام تر سائنسی اور مادی ترقی کے باوجود ابھی تک دنیا بھر کے طبی ماہرین اس ایڈز نامی عفریت کا کوئی علاج دریافت نہیں کر پائے ہیں اور تمام تر مصنوعی اقدامات کے باوجود ایڈز کا مرض دنیا بھر کے طول و عرض میں مزید پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ بیجنگ کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ایشیائی ممالک میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام کو برتھ کنٹرول کے موثر طریقوں اور خاندانی منصوبہ بندی کے فائدوں سے آگاہی فراہم کرنے کی غرض سے وسیع پیمانے پر تشہیری مہم چلائی جائے۔ نیز "جنسیات" (sex education) سے متعلق اسباق کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ آج ہمارے ٹی وی پر جو صبح و شام "چابی والی گولیوں"، "سبز ستارہ کے ٹیکوں" اور "کنڈوم" کے نازیبا اور بے ہودہ اشتہارات کی بھرمار ہے، یہ بیجنگ اور قاہرہ کانفرنسوں کے انھی فیصلوں کا بھرپور نفاذ ہے۔ مغربی ممالک اور بین الاقوامی اداروں کی امداد سے چلنے والی "این جی اوز" ان ممالک اور اداروں کے متعین مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے پاکستان میں "سماجی ترقی اور بہبود" کی آڑ میں جس طرح اپنے دیے گئے اہداف کو پورا کر رہی ہیں، ملتان میں بچوں کے ذریعے کیا جانے والا مذکورہ مظاہرہ اس کی ایک بڑی واضح مثال ہے۔ "کنڈوم"، "چابی والی گولیاں" اور "سبز ستارہ کے ٹیکے"، ان تمام اشیا اور اصطلاحات کو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اتنا عام کیا جا رہا ہے کہ ملک کا بچہ بچہ ان سے اچھی طرح آگاہ اور مانوس ہو جائے اور بالآخر جب ایسا وقت خدانخواستہ آجائے کہ جیسا ماحول، اخلاقیات، روایات اور تہذیبی اقدار مغرب کے ہاں اس وقت پائی جاتی ہیں ویسی ہی ہمارے ہاں بھی پائی جانے لگیں تو یہی وقت ان این جی اوز اور ان کے سرپرستوں کی کامیابی کا ہو گا۔

ان تمام بھیانک نتائج اور برسرزمین موجود ٹھوس اور تلخ حقیقتوں کے باوجود مغرب کی ملمع شدہ اور گلی سڑی تہذیب اور اس کی اقدار کو اقوام متحدہ، اس کے ذیلی سماجی اور رفاہی اداروں اور مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں کے ذریعے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں رائج کرنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں۔ ان سازشوں کی راہ روکنے کے لیے مسلم ممالک کے دانش ور، اسلامی تحریکیں اور جماعتیں، مسلم این جی اوز کیا ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں؟ اسی میں دراصل مسلم معاشروں کے تحفظ، مشرقی و اسلامی تہذیب و روایات اور اقدار کی سلامتی، اور ہمارے رہے سہے سکون کی بقا کا دارومدار ہے۔

اخبار امت

مراکش میں خواتین کا بے مثال مظاہرہ

عبدالغفار عزیز

مراکش جسے عربی میں المملکۃ المغربیۃ کہا جاتا ہے گذشتہ دو برس سے نئے سیاسی تجربات سے گزر رہا ہے۔ عالم اسلام کے انتہائی شمال مغربی کونے میں واقع اس ملک پر اصل اقتدار تو شاہی خاندان کا ہے لیکن اب وہاں کے عوام امور مملکت میں شرکت یا ان پر اثرانداز ہونے کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔ شاہی نظام کے باوجود اب وہاں عوامی فعالیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سال مارچ کی ۱۲ تاریخ کو تو مراکش نے عوامی تحریک کا ایسا منظر دیکھا جو اگر کسی مغربی ملک میں ہوتا یا کسی اسلام بیزار گروہ کی جانب سے تشکیل پاتا تو دنیا بھر کی ٹی وی سکرینوں' ریڈیائی لہروں اور اخباری دنیا میں تہلکہ مچ جاتا۔ کاسابلانکا (دارالبیضا) کے اس مظاہرے میں جو خواتین سے متعلق مغرب کے زیراثر نئے مجوزہ قوانین کے خلاف تھا' ۵ لاکھ سے زائد خواتین نے شرکت کی۔ عین اسی روز رباط میں ۶۰ سے زائد سرکاری و غیر سرکاری تنظیموں نے وزرا کی سرکردگی میں ان قوانین کے حق میں مظاہرہ کیا جس میں زیادہ سے زیادہ ۲۰ ہزار افراد شریک ہوئے۔ برطانیہ کے ہفت روزہ اکانومسٹ کے مطابق یہ دوسرا منتشر جلوس ۴۰ ہزار ننگے سر ادھیڑ عمر حامیوں کا تھا' جب کہ پہلے میں ۵ لاکھ نوجوان باحجاب خواتین منظم قطاروں میں مکے بلند کر کے "جنت کو سلام" (saluting the heavens) کر رہی تھیں۔ ایسے ملک میں جہاں انتخابات میں دھاندلی ہوتی ہو' سب سے بڑی اسلامی پارٹی خلاف قانون ہو' اس طرح کے مظاہرے ہی حمایت ناپنے کا پیمانہ ہیں۔ اکانومسٹ کے مطابق "اسلام پسند ایک کے مقابلے میں دس سے بھی زیادہ سے جیت گئے۔ اگر منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کل منعقد ہوں' تو اسلام پسند انھیں جیت سکتے ہیں" (۱۸ مارچ ۲۰۰۰ء)۔

اگر یہ منصوبہ پارلیمنٹ سے منظور ہو گیا تو ۶۰۰ کے ایوان میں ایک تہائی نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہوں گی (اس وقت صرف ۴ خواتین ممبر ہیں)' خواتین کو وراثت میں مساوی حقوق ملیں گے' تعدد ازدواج پر پابندی ہو گی' شادیوں کے لیے کم سے کم عمر ۱۴ سے بڑھا کر ۱۸ سال کر دی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

اسلامی رہنما ان کو قرآن کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ یہ اقدامات ان کے بقول شیطانی اور یہودی مغرب کو خوش کرنے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ اکانومسٹ نے ایک باحجاب خاتون کو قرآن اٹھائے دکھایا ہے اور اس پر عنوان لگایا ہے: عورت بمقابلہ عورت (women versus women)۔ ہفت روزہ ٹائم (۲۷ مارچ ۲۰۰۰ء) نے وی کا نشان بنانے والی مظاہرے کی شریک خواتین کی تصویر پر عنوان لگایا ہے: نہیں، شکریہ! (no! thanks)۔

اسلام سے محبت رکھنے والی خواتین کے مظاہرے کے شرکا کی تعداد انتہائی غیر معمولی اور سب تجزیہ نگاروں کے لیے حیران کن تھی۔ ۵ لاکھ کی تعداد عالم عرب کے سب سے بڑے روزنامے الشرق الاوسط اور برطانیہ کے وقیع ہفت روزہ اکانومسٹ نے بیان کی جو بہرحال اسلامی تحریک کے حامی نہیں ہیں۔ منتظمین کے اندازے کے مطابق تو یہ تعداد ۱۰ لاکھ تھی۔ اس مظاہرے کی دعوت مراکش کی دو بڑی اسلامی تحریکوں "تحریک توحید و اصلاح" اور "تحریک عدل و احسان" نے دی تھی۔ تحریک توحید و اصلاح تقریباً ڈیڑھ برس پہلے دو اسلامی تحریکوں: تحریک توحید اور تحریک اصلاح و تجدید (حاتم) کے باہم انضمام سے وجود میں آئی تھی اور اب سیاسی میدان میں اہم ترین اسلامی پارٹی ہے۔ اس کے ارکان اسمبلی کی تعداد ۱۰ ہے۔ تحریک عدل و احسان پر گذشتہ ۱۰ برس سے پابندی عائد ہے۔ اس کے سربراہ شیخ عبدالسلام یٰسین کو شاہ حسن نے پاگل خانے بھیج دیا تھا۔ وہ اب تک اپنے گھر میں نظربند ہیں۔ ۱۰ برس کی مسلسل نظربندی اور پارٹی پر پابندی کے باوجود اس قدر توانائی و فعالیت کا مظاہرہ خود پارٹی کے لیے مزید توانائی کا اور حکمرانوں کے لیے اچنبھے کا باعث تھا۔ مظاہرے کی قیادت تحریکوں کے حلقہ ہاے خواتین کی ذمہ داران کے علاوہ مرد قائدین بھی کر رہے تھے اور لاکھوں کے اس 'مظاہرے میں جہاں حجاب کے باوقار اجتماعی منظر نے عالمی میڈیا کے نمایندوں اور حکمرانوں کو ششدر کیا وہیں مظاہرے کے مکمل طور پر منظم' پرسکون اور جذبۂ ایمانی سے سرشار ہونے نے سب کو اعتراف نظم و ضبط پر مجبور کیا۔

الشرق الاوسط نے دونوں مظاہروں کو یکساں اہمیت دیتے ہوئے اپنے صفحہ تین پر یوں سرخی لگائی: "رباط اور کاسابلانکا میں مراکشی حکومت کے خواتین پروگرام کے حق میں اور خلاف لاکھوں کا مظاہرہ"۔ رباط میں لبرل اور بائیں بازو کی خواتین کے مظاہرے کی تفصیل دینے کے بعد اخبار لکھتا ہے: "کاسابلانکا میں بنیاد پرستوں کا مظاہرہ صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔ شہر کی سب سے بڑی شاہراہ شارع محمد السادس پر تقریباً ساڑھے چار کلومیٹر کی مسافت طے کرتے ہوئے مظاہرین نے سیکڑوں بینر اٹھائے ہوئے تھے اور وہ حکومتی منصوبے کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ شہر کی اس بڑی سڑک پر جس کی چوڑائی ۶۰ میٹر سے زائد ہے' مظاہرین دو حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک طرف باحجاب خواتین چل رہی تھیں اور دوسری طرف مرد تھے جن

کی قیادت اسلامی تحریکوں کے رہنما کر رہے تھے۔ اگرچہ اسلامی تحریکوں کو اس مظاہرے کی اجازت صرف ایک ہفتہ پہلے ملی تھی لیکن اس حدیث کو اپنے مظاہرے کا ماٹو بناتے ہوئے کہ "النساء شقائق الرجال: عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی مثل ہیں" انھوں نے بے حد نظم و ضبط، حسن تنظیم اور وقار کا مظاہرہ کیا۔ مظاہرین سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مربوط تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے: "وجدہ سے عیون تک پورا مراکش حکومتی منصوبے کے خلاف ہے"۔ "خواتین تو یہ رہیں، ترقی کہاں ہے؟" (واضح رہے کہ مغربی تہذیب کے پرتو حکومتی منصوبے کا نام "ترقی کے سفر میں خواتین کی شمولیت" رکھا گیا ہے)۔ مظاہرین کا تیسرا اہم نعرہ تھا: "اسلامی مملکت میں مغربی منصوبے نہیں چلیں گے"۔

اتنا غیر معمولی مظاہرہ ہمارے ملکی ذرائع ابلاغ میں اہم تو کیا، غیراہم جگہ بھی نہ پا سکا۔ مراکش اور پاکستان کی آبادی کا تناسب دیکھا جائے تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے یہاں ۲۰ لاکھ خواتین اور مردوں کا مظاہرہ کیا جائے اور یہ تعداد ہم نہیں، عالمی میڈیا اور مخالف بتائیں۔ صرف ایک ہفتے کے نوٹس پر یہ مظاہرہ منظم کرنے میں کتنی تنظیمی قوت لگی ہوگی اور کاسابلانکا کے اطراف میں کیا سرگرمی رہی ہوگی، ہر ہر گھر میں کیا کیفیت ہوگی، ہم یقیناً چشم تصور سے دیکھ سکتے ہیں۔ اکانومسٹ نے لکھا ہے کہ "عدل و احسان" کی نادیہ یاسین حزب اختلاف کی سب سے نمایاں خاتون رہنما ہیں اگر ۳۳ فی صد کوٹہ مختص ہوا تو یہی پارٹی اسے پر کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ اس کے باوجود، خواتین کا یہ مظاہرہ، ان کے ایمان کی حقانیت کا ثبوت ہے۔

دو برس پہلے یعنی ۱۴ مارچ ۱۹۹۸ء کو شاہ حسن ثانی نے اس وقت کی اپوزیشن پارٹیوں کو حکومت سازی کی دعوت دی اور ۳۸ برس سے ملک بدر اپوزیشن لیڈر عبدالرحمن یوسفی کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔ انھوں نے سات اپوزیشن پارٹیوں سے ۳۳ وزیر لیے، سات وزیر خود شاہ حسن ثانی نے مقرر کیے جن میں داخلہ، خارجہ، انصاف اور مذہبی امور کے وزیر شامل تھے۔ ۴۰ وزرا پر مشتمل کابینہ نے دو برس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اب ملک میں حقوق انسانی کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی، اقتصادی بحالی کا سفر شروع ہو گا بلکہ تیز تر ہوگا اور قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔ یوسفی کی حکومت کو کسی قابل ذکر اپوزیشن کا بھی سامنا نہیں تھا۔ خود اسلامی تحریک اصلاح و تجدید نے حکومت میں شامل ہوئے بغیر ملکی ترقی کے لیے ساتھ دینے کا اعلان کیا تھا، لیکن دو برس میں مراکش کوئی تعمیری انقلاب نہیں دیکھ سکا۔ باہم متضاد نقطہ ہاے نگاہ رکھنے والے وزرا مختلف سمتوں میں کھینچاتانی میں مصروف دکھائی دیے۔ خود طویل عرصے اپوزیشن میں رہنے کے باوجود یوسفی نے شیخ عبدالسلام یٰسین کی نظربندی اور ان کی ممنوعہ پارٹی تحریک عدل و احسان پر ہونے والے مظالم کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

دوسری طرف مراکش کے معاشی حالات اچھے نہیں' خشک سالی کا دوسرا برس ہے۔ دیہی علاقوں سے شہر کے اردگرد کی غریب بستیوں کی طرف نقل مکانی جاری ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے اسپین جانے کی کوشش کرنے والے پکڑے بھی جاتے ہیں' سمندر میں ڈوب بھی جاتے ہیں۔ مغرب کے تجزیہ نگار معاشی بدحالی اور گڈ گورننس نہ ہونے کو سیاسی اسلام کی مقبولیت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے گماشتے ۳۰' ۴۰' ۴۰ سال بلاشرکت غیرے حکمرانی کے باوجود جہالت' غربت' ظلم' طبقاتی تفریق اور مغرب کی تہذیبی غلامی سے زیادہ کچھ نہیں دے سکے ہیں۔ یہ مراکش ہی نہیں' ہر اسلامی ملک کی کہانی ہے۔ مسلمان اپنی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق اپنے معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو یہ مغربی آقا' جمہوریت جن کا ورد زبان ہے' جمہوریت قتل کروانے اور ملک کو خاک و خون میں نہلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اس کے باوجود اسلامی احیا کی جدوجہد جاری ہے' آج مراکش میں مساجد کا جال پھیلتا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر اسلام کے حوالے سے سوالات کے جوابات دیے جا رہے ہیں۔ عادل حکومت کی شرائط سے لے کر عوامی حمام میں خواتین کے غسل تک کے بارے میں کتابچے شائع کیے جا رہے ہیں۔ لیکن' اکانومسٹ لکھتا ہے کہ "۸۰ کے عشرے کے آخر میں الجزائر میں بڑھتی ہوئی آزادی سے فائدہ اٹھا کر اسلام پسندوں نے' خواتین کے حقوق کے خلاف لوگوں کو بلا کر' اسٹریٹس (streets) فتح کر لیں۔ الجزائری پریس پڑوسی مراکش کو آخرکار اسلامی احیا کا ہدف بنتے دیکھ کر لطف لے رہا ہے۔ الجزائری اخبار الوطن نے سرخی جمائی: "پرسکون' سیاحوں کے لیے دوستانہ ماحول رکھنے والے ملک کا تاثر طاقت کے ایک ہی مظاہرے سے ختم ہو گیا!"۔ اکانومسٹ مزید لکھتا ہے کہ "الجزائر اور ترکی نے جو سبق دیے ہیں' ان کے پیش نظر' بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ زیادہ وقت گزار رہا ہے"۔

نوجوان بادشاہ نے جو جمہوری آزادی دی ہے' اس کا ایک اظہار اس طرح ہوا کہ مظاہرے کے دن شام کو ٹی وی خبروں میں اسلام پسندوں کے مظاہرے کو سرکاری جلوس کے برابر کوریج دی گئی۔ لیکن ماضی قریب کی تاریخ کا سبق یہ ہے کہ اگر مسلمان جمہوری آزادی کو اپنے دین کے غلبے کی جدوجہد کے لیے استعمال کرتے ہیں' تو ان سے محروم ہی کر دیے جاتے ہیں۔ اگر مسلم حکمران عوام کی مرضی کے مطابق حکومت کریں' تو قوم کی صلاحیتیں باہمی کش مکش کے بجائے تعمیری سرگرمیوں میں صرف ہوں۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہی نظام جمہوریت ہے' جو مغرب کی مرضی کو پورا کرے خواہ عوام کی لاشوں سے گزرے--- وہ قومی ایجنڈے کے عنوان سے مغرب کے ایجنڈے کی تکمیل میں لگ جاتے ہیں' خواہ مغرب انھیں دھتکار تا ہی رہے۔

مراکش میں' یوسفی حکومت نے اب جو سب سے اہم اقدام اٹھایا ہے وہ "ترقی کے سفر میں خواتین کی

شمولیت" کے نام سے بنایا جانے والا پروگرام ہے جس میں مساوات مرد و زن کے فرسودہ نعرے کو بنیاد بناتے ہوئے خواتین کو اسلامی تعلیمات سے دور لے جانے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ مراکش کی لاکھوں مومن خواتین نے اس منصوبے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر کے یوسفی کے لیے اس منصوبے پر عمل کرنا مشکل بنا دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ شاہ حسن کی وفات کے بعد تخت حکومت سنبھالنے والا نوجوان شاہ محمد السادس جسے ایم-۶ بھی کہا جاتا ہے، کیا راہ عمل اختیار کرتا ہے۔

اس ضمن میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا مراکش میں خواتین کے حوالے سے اعلان کیا جانے والا منصوبہ صرف یوسفی حکومت کی اختراع ہے؟ کیا اسلام آباد میں "شرکت گاہ" کے نام سے خواتین کی غیر سرکاری تنظیم کی خلاف اسلام بلکہ معاند اسلام سفارشات اور یوسفی حکومت کی سفارشات میں یکسانیت محض اتفاق ہے؟ کیا اوائل جون میں امریکی شہر نیویارک میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام عالمی خواتین کانفرنس کا ایجنڈا ان سفارشات سے مختلف ہے؟ ان تینوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ قاہرہ اور بیجنگ میں خواتین کانفرنسوں سے شروع ہونے والا عالمی ایجنڈا ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں اور خواتین اور بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کے لیے یکساں تباہ کن مضمرات رکھتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جیت کس کی ہوتی ہے، اور امت مسلمہ اپنا کردار کیونکر ادا کرتی ہے؟

رسائل و مسائل

ٹیلی فون پر دوستی اور ریڈیو پروگرام میں گفتگو

سوال : ایک مسئلے میں بہت پریشان ہوں۔ میری سہیلی ایک لڑکے سے فون پر بات کرتی ہے اور اس لڑکے کا موقف ہے کہ اگر ایک لڑکا اور لڑکی بغیر کسی بے ہودگی کے صرف اور صرف اچھے دوست کی حیثیت سے اسلام' سیاست اور دیگر معاشی موضوعات پر بات کرتے ہیں اور دوستی رکھتے ہیں تو وہ صحیح ہے۔ اس کے علاوہ اس کا (لڑکے کا) موقف یہ بھی ہے کہ شادی سے پہلے حضرت خدیجہؓ اور نبی کریمؐ کی بھی آپس میں بات چیت ہوتی تھی۔ چونکہ ہماری دوستی پاکیزہ ہے اس لیے صحیح ہے۔ لڑکی اور لڑکے کے گھر والے اس دوستی سے بالکل ناواقف ہیں۔ ان دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ لڑکا میری سہیلی سے شادی کا بھی خواہش مند ہے۔ لیکن وہ رشتہ دینے سے پہلے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے--- اور اس بات کی کوئی یقین دہانی بھی نہیں ہے کہ وہ شادی کرے گا بھی یا نہیں---؟ اس سلسلے میں آپ میری رہنمائی فرمائیں تاکہ میں اپنی دوست کو صحیح راہ پر ٹھوس دلائل کے ساتھ قائل کر سکوں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ریڈیو پر ایک سلسلہ فون پر گفتگو کرنے کا ہے جس میں آواز پورے پاکستان میں سنی جاتی ہے۔ اگر پروگرام پیش کرنے والا مرد ہو اور بات کرنے والی خاتون ہو'--- اور اگر پروگرام پیش کرنے والی بھی خاتون ہو تو ایک لڑکی کا یوں فون کر کے بات کرنا یا کسی موضوع پر بحث کرنا کس حد تک مناسب ہے؟ کیا یہ سلسلہ درست ہے؟

جواب : آپ کے سوال کا تعلق اسلام کے معاشرتی اخلاق سے ہے۔ اسلام کے دین کامل اور مکمل نظام حیات ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ نہ صرف عبادات' اور حقوق اللہ بلکہ معاشرتی معاملات میں بھی جامع اور واضح ہدایات فراہم کرے۔ ایک اجنبی مرد اور عورت کے درمیان گفتگو کے حدود و آداب کیا ہوں؟ یہ بھی اسلام کا ایک اہم اور تفصیل طلب موضوع ہے۔

آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً آپ نے جو مفروضہ قائم کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ اگر نیک نیتی اور بغیر کسی شیطانی وسوسے کے "اچھے دوست" کی حیثیت سے ایک مسلمان مرد اور عورت فون پر یا یونی ورسٹی یا کالج میں یا بازار یا کسی مطعم (cafeteria/resturant) میں تیسری عالمی جنگ کے واقع ہونے یا نہ ہونے، انسانی اعضا کی پیوندکاری، اقبال کے تصور خودی، یا ذبیحہ کے حرام و حلال ہونے پر ایک دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہیں، تو جب تک نیت میں فتور نہ آجائے، یہ ایک "معصوم" اور بے ضرر "دوستانہ" سرگرمی ہے۔ ہاں، جس لمحے دونوں میں سے کسی کے دل میں دوسرے کے لیے دل چسپی یا محبت کا جذبہ پیدا ہو، گفتگو حرام، مکروہ اور مردود کے دائرے میں داخل ہو جائے گی، اس لیے فوراً منقطع کر دی جائے۔ اس مفروضے کی دلیل بھی ایک دل چسپ مفروضے پر قائم کی گئی ہے اور یہ تصور کیا گیا ہے کہ عقد نکاح سے قبل جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدہ خدیجہؓ کے نمایندہ کی حیثیت سے ان کے مال کو تجارتی قافلوں میں لے کر جاتے تھے تو آپؐ سیدہ خدیجہؓ سے لمبی چوڑی گفتگو بھی کرتے تھے۔ سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ انبیاے کرام نبوت ملنے سے قبل بھی عادل اور صالح ہوتے ہیں اور اپنے معاملات میں حیا اور اخلاقی حدود کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اگر کسی مقام پر دو جملوں سے مدعا پورا ہو جائے تو وہاں ایک طول طویل خطبہ نہیں دیتے۔ اسی بنا پر اگر آپ حضور نبی کریمؐ کے خطبات کا مطالعہ کریں تو یہ اہم بات نظر آئے گی کہ وہ انتہائی مختصر، جامع، بلیغ اور موثر ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپؐ سیدہ خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر جاتے تھے تو تجارتی مال کے حوالے سے آپؐ نے جو بات بھی فرمائی ہو گی وہ صرف ضرورت کی حد تک ہی ہو گی اور آپؐ کی اسی دیانت اور کفایت سے متاثر ہو کر آپؐ کو نکاح کا پیغام دیا گیا۔

اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ معاملات کی تقسیم ضروریات، حاجات اور تحسینات میں کی جائے۔ چنانچہ جس حد تک گفتگو کرنا ضروری ہو، مثلاً آپ کو سفر میں کسی سے راستہ پوچھنا ہے، ہسپتال یا مسجد یا ڈاک خانے کا پتا دریافت کرنا ہے، ایک دکان دار سے کپڑے کی قیمت معلوم کرنی ہے، ایک ڈاکٹر کو اپنے گلے میں خرابی، بخار اور جسم میں درد کی کیفیت سے آگاہ کرنا ہے، تو ان تمام معاملات کو ہم صرف ایک اصطلاح یعنی "ضرورت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ضرورت کی حد تک بات کرنے کی اجازت خود قرآن کریم نے واضح طور پر دی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ (احزاب ۳۳:۵۳) "نبی کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے"۔

اس آیت مبارکہ نے اہل ایمان کو نہ صرف امہات المومنینؓ سے سوال کرنے یا کوئی چیز مانگنے کے لیے اسلامی طریقہ سکھایا بلکہ قیامت تک کے لیے عام مسلمانوں کے ایک معاشرتی مسئلے کا حل بھی تجویز کر

دیا۔ گویا ضرورت کی حد تک سوال کرنا، کوئی بات دریافت کرنا، کسی چیز کا مانگنا جائز قرار دیا گیا۔ یہی سبب ہے کہ سیدہ عائشہؓ اپنے حجرے میں پردے کے پیچھے سے بیٹھ کر صحابہ کرامؓ کو قرآن، حدیث و فقہ کی تعلیم دیتی تھیں جس کے نتیجے میں مدینہ منورہ کے معروف فقہاے سبعہ آپؓ سے تربیت پا کر مسند علم پر فائز ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ عمل فرض کی تعریف میں آتا ہے کیونکہ قرآن نے حلال و حرام کے علم کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کیا ہے۔

ایک نوجوان لڑکی اور لڑکے یا ایک دفتر میں کام کرنے والے افسر کا کسی دفتر کی خاتون کے ساتھ نوک جھونک کرتے ہوئے چائے کی ایک پیالی پر آدھے گھنٹے تک حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنا، یا ۴۵ منٹ تک فون پر کرکٹ میچ پر تبصرہ کرنا، اسلامی نقطۂ نظر سے "ضرورت" کی تعریف میں نہیں آتا۔ اسی طرح کوئی "بے ہودہ بات" کیے بغیر محض "اچھے دوست" کی حیثیت سے بات کرنا بھی کسی "ضرورت" میں نہیں آتا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اسلام نے عائلی زندگی کے لیے نکاح کو شرط قرار دیا ہے لیکن ایک مرد اور عورت نکاح کے بغیر "اچھے دوست" کی حیثیت سے اور کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیے بغیر ایک گھر میں ساتھ رہیں تو کیا یہ عمل اخلاقی حیثیت سے درست اور اسلامی طور پر مباح ہو جائے گا؟ ہاں، ایک طالب علم یا طالبہ کو اگر ایک معلم یا معلمہ سے سیاسی، معاشی اور دیگر درسی علوم پر تبادلہ خیالات کرنا ہے تو وہ اس کی علمی ضرورت ہے، اور صرف اس حد تک جائز ہو گا جتنا ضروری قرار دیا جا سکے۔ برقیاتی خط و کتابت کے اس دور میں کمپیوٹر پر گپ شپ (chat) پر بھی یہ اصول نافذ ہو گا اور بلا ضرورت اس قسم کی حرکت جائز نہیں ہو جائے گی۔

اسلام میں دوستی کی بنیاد صرف "معروف" پر ہے "منکر" پر نہیں۔ "معروف" کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور اسے خوش کرنے والی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے رشتوں اور تعلقات کی بنیاد کو خود محترم قرار دیتے ہوئے محرم اور غیر محرم کا تعین فرما دیا ہو اور کھانے پینے اور بات چیت اور سوشلائزیشن کے لیے حدود کا تعین کر دیا ہو، تو اللہ تعالیٰ کو اسی وقت خوش کیا جا سکتا ہے جب اس کی حدود کا پورا خیال رکھا جائے۔

دوسرا مسئلہ جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے یعنی نسوانی آواز کا ستر عورۃ ہونا یا نہ ہونا، اس پر فقہاے امت میں ایک سے زائد آرا پائی جاتی ہیں۔ جس آیت کا اوپر حوالہ دیا گیا وہ خود یہ واضح کر دیتی ہے کہ آواز میں لچک پیدا کیے بغیر کسی بات کا جواب دینا جائز ہے۔ اگر آواز کا بھی پردہ ہوتا تو قرآن کریم اس بات کی اجازت نہ دیتا اور سیدہ عائشہؓ جو بعد کے فقہاے امت سے زیادہ قرآن کے مطالب اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سمجھتی تھیں اور جن کا حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے علاوہ دیگر صحابہ سے

کوئی خونی رشتہ نہ تھا، پردے کے پیچھے سے تعلیم نہ دیتیں۔ سنت مطہرہ نے ہمیں جو اصول دیا ہے وہ بڑا واضح ہے۔ ایسی ہر چیز جس پر آپ کا دل اندر سے آپ کو متوجہ کرے کہ یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوتی، تو فوری طور پر قرآن وسنت کی روشنی میں جانچیے۔ اگر قرآن و سنت کے منشا کے مطابق ہو تو مطمئن ہو جایئے، ورنہ اسے ترک کر دیجیے۔ واللہ اعلم بالصواب! (پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد)۔

حجاب میں تدریج

س: میں ایک مقامی سرکاری اسکول میں ٹیچر ہوں۔ ہمارے اداروں کا المیہ جہاں نظام تعلیم کی بڑی خرابی ہے وہاں خواتین کے اداروں میں پردے کا مسئلہ بھی ہے۔ مرد ملازمین بھی اسکول کالجوں میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے طور پر پردے کا اہتمام کرتی ہوں۔ ساتر لباس کے ساتھ بڑی چادر استعمال کرتی ہوں اور جہاں کہیں مرد ملازم کا سامنا ہو تو اسی چادر سے چہرے کو ڈھانپ لیتی ہوں۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں کوئی خاص اشکال نہ تھا اس لیے کہ میں تقریباً ڈیڑھ گز چوڑائی میں، بڑے سائز میں، چادر بنواتی ہوں۔ ایک ذمہ دار خاتون نے ایک الجھن میں ڈال دیا۔ وہ خود تو ملازمت نہیں کرتیں کہ "ان اداروں کے اندرونی ماحول سے واقف ہوں"، تاہم انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چادر "جلباب" کے زمرے میں نہیں آتی۔ آپ کو اپنے ادارے میں فل سائز چادر کے ساتھ جانا چاہیے، نیز چادر کا رنگ بھی زیادہ نمایاں نہ ہو۔

میں اور میرے ساتھ کی بہنیں بالعموم ایسا ہی کرتی ہیں کہ آج کل میچنگ سوٹ ملتے ہیں یا ریشمی سوٹ کے ساتھ اسی سوٹ کی ہم رنگ لان یا کاٹن لے کر اتنے سائز کی چادر بنا لی جو کولھوں تک آجاتی ہے۔ بوقت ضرورت چہرہ ڈھانپ لیا اور پھر کلاس روم، سٹاف روم یا جہاں ہماری پرائیویسی ہوتی ہے اور مرد ملازم نہیں آتے جاتے وہاں آرام سے اسی چادر کے ساتھ آتے جاتے ہیں، جب کہ بہت بڑے سائز کی چادر سنبھالنا، اس کے ساتھ پڑھانا، تکلیف دہ ہوتا ہے اور رکاوٹ بنتا ہے۔ پھر گرمیوں کے موسم میں تو مزید مشکل یہ ہوتی ہے کہ ایک کمرے میں ۷۰، ۷۵ طالبات کی وجہ سے ہی گھٹن ہوتی ہے وہاں مزید بڑے سائز کی چادر تکلیف کا باعث ہوگی۔

آئیڈیل صورت تو یہی ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں "جلباب" نہ چھوڑا جائے لیکن اس سے ایک اور مسئلہ بن جاتا ہے۔ آج کے دور میں طالبات پردے سے ویسے ہی "الرجک" ہوتی ہیں ایسی مشکل صورت دیکھ کر وہ مزید دور ہو جاتی ہیں۔ میں اپنی طالبات کو ترغیب دیا کرتی ہوں کہ اگر برقعہ نہیں پہن سکتیں تو بڑے سائز کی چادر کے ساتھ اپنا چہرہ اور جسم ڈھانپ لیا کرو۔ ان کی

وہ چادر قمیص تک لمبی ہوتی ہے' ٹخنوں تک نہیں۔ ماحول کو دیکھ کر میں یہ سوچتی ہوں کہ فی الحال بچیاں اس پردے کو اپنائیں' جب آہستہ آہستہ شعور بڑھے گا اور پردہ کرنے کی عادت پڑ جائے گی تو پھر چادر کا سائز بھی بڑا کر لیں گی۔ اب تک جتنی بھی طالبات زیر تعلیم رہی ہیں ان میں سے ۷۰ فی صد سے زائد بچیاں اس طرح پردہ کرنے لگیں۔ اب بھی راہ چلتے دیکھتی ہوں تو باپردہ ہی نظر آتی ہیں۔ اب اس پریشانی میں ہوں کہ "جلباب" میں ان کی نفسیاتی کیفیت کو دیکھ کر جو رعایت میں نے دی تھی' شاید غلط تھی؟ (میں خود اسکول سے باہر برقعہ ہی پہنتی ہوں)۔

ج: "جلباب" کی اصطلاح قرآن کریم میں سورہ احزاب میں آیت ۵۹ میں استعمال ہوئی ہے۔ "اے نبیؐ' اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں (جلابیبھن) کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (۳۳:۵۹)۔

"جلباب" کی وضاحت سید مودودیؒ نے یوں کی ہے "جلباب عربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں" (تلخیص تفہیم القرآن' ص ۶۶۸)۔ اس کا ترجمہ برقعہ تو کسی بھی طرح نہیں کیا جا سکتا' گو برقعہ کا استعمال اسی غرض سے کیا جاتا ہے۔ جو شکل آپ نے اختیار کی ہے' "جلباب" سے بعینہٖ یہی مراد ہے' یعنی ایسی چادر جسے ضرورت کے پیش آنے پر چہرہ چھپانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ اس میں کسی رنگ اور کسی قسم کے کپڑے کی کوئی قید نہیں ہے' البتہ لباس کے عمومی اصول اس پر بھی جاری ہوں گے۔ اگر اسلام عام حالات میں یہ چاہتا ہے کہ مرد شوخ اور گہرے رنگ استعمال نہ کریں' جب کہ خواتین کے لیے یہ پابندی نہیں ہے تو ہم کس بنیاد پر یہ پابندی لگا سکتے ہیں کہ جلباب کی چادر ہمیشہ سیاہ یا سفید رنگ کی ہی ہو؟

اگر ایک چادر کا رنگ آپ کے لباس سے مناسبت رکھتا ہے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح آپ کی حکمت عملی کہ ان بچیوں کو جو حجاب اور ستر عورۃ کی پابندی نہیں کرتیں' پہلے ایسے اسکارف کے استعمال پر آمادہ کیا جائے جس سے ان کا سر اور جسم اور جسم کا اوپر کا حصہ مکمل طور پر ڈھک جائے چاہے چہرہ کھلا رہے' اور پھر انھیں لمبی چادر یا ایسے لباس کے استعمال کی طرف لایا جائے جو تمام جسم کو مناسب طور پر ڈھانک سکے' اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ نبی کریمؐ نے بھی دین کی طرف راغب کرنے کے لیے دین میں آسانی پیدا کرنے اور بتدریج اسلام کی تعلیم دی ہے۔ اسی کا نام دین میں توازن ہے (ا-ا)۔

مال حرام کا مصرف

س : "رسائل و مسائل" کے تحت زیرعنوان "زکوٰۃ سے آئی کیمپ کا انعقاد" (اپریل ۲۰۰۰ء) آپ نے لکھا ہے کہ ناجائز مال کا صدقہ کرنے سے ثواب نہیں ملتا لیکن آدمی گناہ سے بچ جاتا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل سوالوں کی وضاحت فرمادیں:

۱- رشوت کے مال سے اگر ایک آدمی مسجد تعمیر کرتا ہے تو کیا وہ گناہ سے بچ جائے گا؟

۲- اگر وہ ناجائز مال جہادی تنظیموں کے فنڈ میں جمع کرائے تو کیا گناہ سے بچ جائے گا؟

۳- کیا مال دار لوگوں سے رشوت لے کر غریبوں اور فقرا میں تقسیم کرنا جائز ہے؟

۴- کیا ایک نیک کام کے لیے ورائٹی شو یا شام موسیقی منعقد کرانا جائز ہے؟

ج : مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ جس آدمی سے لیا ہو، اسے واپس کرے۔ واپس کرنا ممکن نہ ہو تو پھر اس کا مصرف فقرا و مساکین ہیں۔ رشوت جس آدمی سے لی ہو، سود جس آدمی سے لیا ہو، جوئے سے جس آدمی کا مال لوٹا ہو، یہ اموال انھیں واپس کرنا چاہییں۔ اگر انھیں واپس کر دیا تو لینے کا گناہ ختم ہو جائے گا۔ اگر انھیں واپس نہ کیا اور معلوم بھی نہ ہو کہ کتنے لوگ اور کہاں کہاں کے لوگ ہیں جن کا مال لوٹا گیا ہے تو ایسی صورت میں اگر مال فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیا جائے تو خود استعمال کرنے کا جو گناہ ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ نیت یہ کی جائے کہ یہ مال جن مستحقین کا لوٹا ہے، ان کی طرف سے ہے۔ ایسی صورت میں فقرا و مساکین مستحقین کے نائب کی حیثیت سے اس مال کو وصول کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے مال قبول کرلیا تو توبہ اور مال کو مستحقین کی طرف سے تقسیم کرنے کی وجہ سے رشوت لینے کا گناہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اگر مستحقین کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے قبول نہ کیا تو پھر گناہ ختم نہ ہوگا لیکن اس میں کمی آجائے گی۔ خود کھاتا تو گناہ زیادہ ہوتا، فقرا کو دے دیا تو گناہ کم ہوگیا۔

رشوت کے مال سے مسجد تعمیر کرنا، جہادی تنظیموں کے فنڈ میں جمع کروانا ناجائز ہے۔ اگر اس نیت سے رشوت لیتا ہے تو دہرا گناہ ہوگا، ایک حرام لینے کا، دوسرا اس سے مسجد تعمیر کرنے کی نیت کرنے اور جہاد میں خرچ کرنے کا۔ غریبوں میں تقسیم کرنے کی نیت سے رشوت لینا ناجائز ہے۔ نیک کام کے لیے حرام طریقوں سے مال حاصل کرنا بھی دہرا گناہ ہے، ایک حرام کمائی کا اور دوسرا نیک کام میں خرچ کرنے کا (مولانا عبدالمالک)۔

کتاب نما

تاریخ اسلام اور مسلمانوں کی نشاتِ ثانیہ، پروفیسر انور رومان۔ ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔ صفحات: ۲۳۰۔ قیمت: ۹۰ روپے۔

مسلمانوں کی نشاتِ ثانیہ دورِ حاضر میں ملت اسلامیہ کا غالباً سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اہم موضوع بھی۔ پروفیسر انور رومان نے اپنے وسیع مطالعے کے پس منظر میں اور بڑی دردمندی کے ساتھ اسی مسئلے پر کلام کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم ممالک کے ظاہری حالات حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ۸۰ فی صد سے زیادہ آبادی "حال مست اور مال مست" ہے۔ صرف ۱۵، ۱۶ فی صد قصباتی اور متوسط آبادی، خواندہ، باشعور، روشن خیال اور متحرک ہے۔ اکثر و بیشتر مسلم حکمران، عالمی استعماری طاقتوں کے "طفیلی سیارے" ہیں یا ان کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ اس صورت میں مسلم نشاتِ ثانیہ ایک گریزپا خواب معلوم ہوتا ہے۔

مصنف نے تاریخ کے اوراق الٹ کر ملت اسلامیہ کی موجودہ صورت حال یا اسباب زوالِ امت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ خلفاے راشدین کے نظم و حکومت اور پھر دورِ ملوکیت کے بعض اہم حکمرانوں کے مختلف اقدامات کا تجزیہ کیا ہے۔ (اسے وہ خلافت ملوکیہ کہتے ہیں کیونکہ یہ نام کی خلافت تھی مگر فی الحقیقت ملوکیت تھی)۔ پروفیسر انور رومان نے بڑی صاف گوئی سے کچھ سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے متفق نہیں ہیں جو مسلم اکابر کی بشری کمزوریوں کا ذکر کرنا بھی روا نہیں سمجھتے۔ بلکہ مصنف اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمانوں پر چھائی ہوئی مسکنت کے اسباب تلاش کرنا ضروری ہیں اور اس ضمن میں غلط فہمی، خوش فہمی اور افراط و تفریط سے بچتے ہوئے، جائز اور متوازن تنقید میں کوئی حرج نہیں، مگر اس کا مطلب سب و شتم یا تبرابازی بھی نہیں۔ مصنف نے اموی، عباسی اور دیگر ملوکیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے خصوصاً حضرات معاویہؓ، عقبہ بن نافعؓ، ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے مثبت کارناموں اور ساتھ ہی ان کے کمزور یا منفی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے بقول "تاریخ کو ہمیشہ دونوں کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے اور میزان عقل اور میزان عدل دونوں پر تولنا چاہیے" (ص ۵۷)۔ خود مصنف نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا تجزیہ چشم کشا ہے۔ مسلم تاریخ کے بعض پہلو عبرت آموز ہیں اور بعض تاریخ عالم کے زریں اوراق۔

ایک حصے میں مصنف نے بتایا ہے کہ یہ ایمان اور قرآن تھا جو ملائیشیا اور انڈونیشیا کے علاقے میں اسلام کی روشنی پھیلنے کا سبب بنا۔ "اسلام کی قوت نامیہ" کے اسباب یہ تھے: اسلامی عقائد' عبادات' معاملات' اخلاق' علم و فضل' خواندگی' تعلیم عامہ' اسلامی معاشرہ اور حکومت اسلامیہ۔ ایک باب میں تصوف پر بھی بحث کی ہے مگر توازن کے ساتھ۔ کہتے ہیں: "مسلمانوں نے شاید تصوف کے زیر اثر وجدانیات کو جتنی مضبوطی سے پکڑا' عقلیات و شعوریات سے وہ اتنا ہی گریزاں و لرزاں رہے" (ص ۱۱۹)۔ باب ہفتم (مسلمانوں کے زوال کے اسباب) ساری بحث کا حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں: کچھ اسباب و علل (دھندلے ہونے کے باوجود) مسلمانوں کی نشات ثانیہ کا پتا دے رہے ہیں کیونکہ ان کی نظریاتی اساس بہت مضبوط ہے۔ علم و فن اور حکمت و دانش کے پہلو پر بھی خاص توجہ دینی ہوگی۔ معاشرے کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا ہوگا۔ پھر نظم حکومت کو صحیح معنوں میں اسلامی اصولوں پر استوار کرنا ہو گا۔ مصنف نے "مجلس اقوام اسلامیہ" کا تصور پیش کیا ہے جس کا مرکز مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ ہو۔ کہتے ہیں: یہ بات باعث اطمینان ہے کہ حکومت سعودیہ ملوکیت ہونے کے باوجود خادم حرمین شریفین کا فریضہ بہ احسن طریق انجام دے رہی ہے (ص ۲۱۱)۔ مگر' ان کے خیال میں' بین الاقوامی منظرنامے میں مسلمانوں کا کمزور ترین پہلو غالباً ان کے حکمران ہیں: شخصی اور موروثی' عموماً بے ذوق' بے حس اور اقتدار مست۔ فوجی حکمران امتداد اقتدار کے متعلق سوچتے ہیں اور نام نہاد جمہوری حکمران بس اپنی کرسی بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان سب کو نہ تو قومی اور عوامی مسائل کا ادراک ہے نہ تردد۔ وہ کسی نہ کسی عالمی سپرطاقت کی جیب میں ہیں اور ان کی خواہشات کے غلام ہیں (ص ۱۵۹)۔

پروفیسر انور رومان رجائیت پسند ہیں۔ مسلمانوں کا مجموعی بین الاقوامی منظرنامہ حوصلہ افزا نہیں ہے مگر مصنف متوسط طبقے سے پُرامید ہیں' جن کے ہاں ماضی کی جان دار روایات اب بھی زندہ ہیں اور یہ کسی تابناک مستقبل کی نقش گری کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ جمال الدین افغانی' علامہ اقبال' مولانا مودودی' مولانا محمد الیاس اور ان جیسے بہت سے مشاہیر اسلامی ممالک میں اصلاح امت اور نشات ثانیہ کے لیے سرگرم عمل رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ملوکیت کی آکاس بیل سے چھٹکارا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی رجوع الی اللہ ناگزیر ہے۔ وہ کہتے ہیں: ارجعوا الی القرآن' ارجعوا الی محمد (قرآن کی طرف لوٹ جاؤ' محمدؐ کی طرف لوٹ جاؤ) میں ہی نشات ثانیہ مل سکتی ہے' ملے گی' ضرور ملے گی (ص ۱۸۰)۔

ہمارے خیال میں پروفیسر انور رومان نے مسلم نشات ثانیہ کے مسئلے کو بڑی خوبی' عمدگی اور توازن کے ساتھ سمجھا اور سمجھایا ہے۔ ان کا تجزیاتی انداز عالمانہ اور دردمندانہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی وسیع اشاعت مفید رہے گی' اگر انگریزی' عربی اور دیگر زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو سکے تو بہت اچھا ہے (رفیع الدین ہاشمی)۔

شہداے بالاکوٹ --- ، ڈاکٹر ایچ بی خان۔ ناشر: الحمد اکادمی، ۲ جے ۱۸ / ۱، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰۔ صفحات: ۲۱۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

اس کتاب کا مکمل نام ہے: **شہداے بالاکوٹ کا مقدس خون درحقیقت قرارداد پاکستان**۔ یہ طویل نام، کتاب سے زیادہ اخبار کی سرخی یا کوئی قرارداد محسوس ہوتی ہے۔

تاریخی واقعات میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ قیام پاکستان کو وادی سندھ میں محمد بن قاسمؒ کے قدم رکھنے سے جوڑا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا نہ ہوتی تو انگریز رخصت نہ ہوتے، پاکستان قائم نہ ہوتا۔ اسی طرح سید احمد شہیدؒ نے تحریک مجاہدین برپا نہ کی ہوتی تو انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی جدوجہد آزادی شروع نہ ہوتی۔

اس کتاب کا تقریباً نصف سید احمد شہیدؒ کی تحریک پر اور نصف قیام پاکستان کی جدوجہد پر ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد پر غلام رسول مہرؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قابل قدر کاوشیں موجود ہیں۔ اسی طرح قیام پاکستان پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب جس نے ایک مقالہ نویسی مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا، قیام پاکستان کو اس جدوجہد کا فطری نتیجہ قرار دیتی ہے جس کا آغاز شاہ ولی اللہؒ نے کیا تھا۔ اسی لیے جدوجہد پاکستان کو مسلم لیگ اور کانگریس کی قراردادوں کے حوالے سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ کتاب واضح کرتی ہے کہ ابھی تک وہ مقاصد حاصل نہیں ہوئے جس کے لیے شہداے بالاکوٹ نے اپنا خون پیش کیا۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے غیر معمولی قربانیاں دیں اور ۱۹۴۷ء میں گھربار لٹائے اور عزتیں قربان کیں۔ کتاب کا اختتام بجا طور پر قرارداد مقاصد پر کیا گیا ہے، جو دراصل اللہ تعالیٰ سے ایک عہدوپیمان ہے جسے پورا کرنا حکمرانوں کی آئینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔

اس نوعیت کی کتابوں کو پڑھنے والے ویسے ہی کم ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن اگر پیش کش معیاری نہ ہو تو اور بھی کم ہو جاتے ہیں (**مسلم سجاد**)۔

خواتین کمیشن رپورٹ کا جائزہ، ثریا بتول علوی۔ ناشر: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۶۴۔ قیمت: ۹ روپے۔

ماضی میں خواتین بالعموم امتیازی سلوک کا شکار رہی ہیں اور جدید دور میں بھی "حقوق" اور "مساوات" کے نام پر انھیں فریب دیا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ نہ تو فرزندان اسلام اس بارے میں اپنے فرائض سے واقف ہیں اور نہ اسلام کی بیٹیوں کو اپنے حقوق و فرائض سے

کماحقہ، آگاہی حاصل ہے۔

ہمارے ہاں مختلف حکومتوں نے خواتین کے اصلاح احوال کے لیے مختلف کمیشن قائم کیے مگر ان کے نتیجے میں پاکستانی خواتین کی وہ حیثیت معین و مشخص نہ ہو سکی، جس سے خواتین اپنا صحیح اسلامی کردار ادا کر سکتیں۔ اگست ۱۹۹۷ء میں خواتین کمیشن کی ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ شرکاے کمیشن نے مختلف حوالوں سے تجاویز پیش کی تھیں۔ پروفیسر ثریا بتول علوی نے، جو ایک نمایاں اہل قلم خاتون کے طور پر پہچانی جاتی ہیں، متذکرہ تمام تجاویز کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات سے جو تجاویز متصادم ہیں ان کی نشان دہی کی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی طرز زندگی کو جہاں جہاں مسائل کا "حل" بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس فریب کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔ ان کا طرز تحریر دل کش اور استدلال موثر ہے۔ لکھتی ہیں:

> امریکہ میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی اور نہ سپریم کورٹ کی جج بن سکی--- برطانیہ کے دارالعوام میں خواتین ارکان کا تناسب ۳ فی صد، امریکہ کے ایوان نمایندگان میں ۲ فی صد، جرمن پارلیمنٹ میں ۷ فی صد، سابقہ سوویت یونین میں ۳۰ فی صد رہا ہے۔ یہ ان ممالک کا حال ہے جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کو شانہ بشانہ اور قدم بقدم رکھا جاتا ہے اور جہاں نام نہاد آزادی نسواں عروج پر ہے (ص ۱۳)۔

دستور، سیاسی امور میں شرکت، شہریت، عائلی قوانین، قوانین ملازمت، قوانین فوج داری، قوانین حدود، قانون شہادت، ترقی کے حقوق اور اداروں کی اصلاح کے حوالے سے پروفیسر صاحبہ نے جن تجاویز کو غیر معقول محسوس کیا ہے، ان کی نشان دہی کی ہے۔

طباعت و اشاعت کا معیار عمدہ ہے۔ فہرست عنوانات آغاز میں ہونی چاہیے تھی۔ اسلام، پاکستانیات اور حقوق و آزادی نسواں کے موضوعات پر یہ ایک اہم تحریر ہے (محمد ایوب منیر)۔

سرسید کا اصلاحی مشن، از ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی۔ ناشر: یونی ورسل بک ہاؤس، عبدالقادر مارکیٹ، علی گڑھ۔ صفحات: ۲۰۵۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

انگریزی استعمار کے زمانے میں ایک جانب تو سید احمد شہیدؒ اپنے مجاہد رفقا کے ساتھ ایمان و عشق کی داستانیں رقم کر رہے تھے اور دوسری طرف یہاں کے جاگیردار، مراعات یافتہ طبقے اور مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ طرح طرح کے مفادات حاصل کر رہے تھے۔ ان کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی موجود تھا اور اس کا کام بڑا مشکل تھا۔ اس کے راہبر سید احمد خاں تھے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے احساس عدل کے ساتھ سید احمد خاں کے تصور اور عمل کو پیش کرنے

کی کوشش کی ہے۔ دور سرسید میں مسلمانوں کو ایک مخصوص سیاسی صورت حال کا سامنا تھا۔ اس تناظر میں مصنف نے سرسید کی خدمات کا بے کم و کاست ذکر کیا ہے مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ سرسید کو آنکھیں بند کر کے مذہبی پیشوا تسلیم کر لیں اور نہ اس طرز فکر کو قرین انصاف سمجھتے ہیں کہ کچھ اختلافات کی وجہ سے سرسید کو سب و شتم کا نشانہ بنایا جائے۔

سرسید کی تصنیف خطبات احمدیہ کے بارے میں مصنف رقم طراز ہیں: "بے پناہ عقیدت رسولؐ کے جذبہ و خلوص کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اس تصنیف کو سرسید کی دیگر تمام تصنیفات میں سرفہرست رکھا جائے تو بے جا نہیں" (ص ۸۱)۔ ولیم میور کی دل آزار کتاب Life of Muhammad (حیات محمدؐ) کو دیکھ کر سرسید تڑپ اٹھے۔ انھوں نے لکھا: "ان دنوں قدرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور کی کتاب --- نے دل جلا دیا، اور اس کی ناانصافیوں کو دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔ اس ضمن میں کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے لائق ہو جاؤں تو بلا سے" (ص ۷۹)۔ کاش، سرسید کا کندھا استعمال کرنے والے آج کے نام نہاد مسلم دانش ور، ایسا قلم اور ایسا دل پیش کر پاتے!

ڈاکٹر فلاحی نے یہ بھی لکھا ہے: "بعض مذہبی امور و معاملات کی توضیح و تعبیر میں حزم واحتیاط کے تقاضوں کا دامن ان سے چھوٹ جاتا ہے (ص ۴۴)--- ان میں بڑا جوش و ولولہ تھا..... لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ان بزرگوں کی طرح قرآن و سنت کے رمزشناس و نکتہ داں نہ تھے جس کی بنا پر، تمام تر خلوص و نیک نیتی کے باوجود تاویل و تفسیر میں حد سے تجاوز کر گئے (ص ۴۸)۔ ان کے خیال میں سرسید کی اصل حیثیت ایک مصلح کی ہے۔ وہ اپنے اصلاحی مشن میں وہابی تحریک کے علم برداروں سے بھی کافی متاثر تھے، لیکن تجدد کا علم اپنے ہاتھوں میں لیا تو نیچراور سائنس کی مطابقت کے شوق میں وہ کافی دور نکل گئے (ص ۲۷)۔

مصنف نے سرسید کی آرا کو، مذہب، تعلیم، سیاست اور معاشرت کے حوالے سے پرکھا ہے۔ یوں کم ضخامت کی کتاب میں بڑے توازن کے ساتھ ایک وسیع موضوع کو، کامیابی کے ساتھ سمو دیا ہے (**سلیم منصور خالد**)۔

ہمیں خدا کیسے ملا؟، ڈاکٹر عبدالغنی فاروق۔ ناشر: مکتبہ تعمیرانسانیت، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۹۴۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

اس وقت مغرب اوراسلام کے حوالے سے جمہوریت اور انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ خواتین کا ذکر بھی ایک بڑے مسئلے کے طور پر ہوتا ہے کہ اگر اسلام، خواتین کے بارے میں اپنا روایتی موقف تبدیل نہیں کرتا تو اکیسویں صدی کی جدید خاتون کو کیسے ساتھ لے سکتا ہے؟

دوسری طرف ہمارے علم میں یہ بھی آتا ہے کہ مغرب میں عورت کی نام نہاد مساوات اور آزادی نے اس کو بڑا مظلوم بنایا ہے اور اعداد و شمار تفصیل پیش کرتے ہیں کہ وہ کتنی مظلوم ہے۔ اس کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس وقت اسلام قبول کرنے کا رجحان مردوں کی نسبت خواتین میں زیادہ ہے۔ ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے انھیں اسلام کے سائے میں آکر سکون اور پناہ مل گئی۔

نومسلموں کے قبول اسلام کی داستان، ہم خاندانی مسلمانوں کے لیے بڑی ایمان افروز ہوتی ہے (شرم اور عبرت اپنی جگہ)۔ ناشر بھی اس طرح کی کتابوں کی اشاعت سے نہیں ہچکچاتے۔ اس کتاب میں مریم جمیلہ سے لے کر جمائما خان تک، ۸۱ داستانیں جمع کر دی گئی ہیں۔

اس کتاب میں نہ صرف مغربی دنیا بلکہ ایشیائی ممالک (مثلاً کوریا، جاپان اور خود پاکستان) کی نومسلم خواتین کے حالات بھی شامل ہیں۔ مصر کی اداکارہ سمیرالباہلی، جو فلمی زندگی ترک کر کے ایک مومنہ بن گئیں، انھیں بھی شامل کیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے آخر میں مغرب کی خواتین کی حالت زار ایک ضمیمے میں اور دوسرے ضمیمے میں تحریک آزادیٔ نسواں پر اقبال کی تشویش نثر و نظم میں بیان کی ہے۔

قبول اسلام کے ساتھ جو مسائل پیش آتے ہیں، خاندان اور ماحول سے جو کش مکش ہوتی ہے، ان کا بیان بھی ہم مسلمانوں کے لیے جو اسلامی ماحول میں پرورش پاتے ہیں، عجیب سا لگتا ہے۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ ہم عرب جاہلیت کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ ہر ایک کا پس منظر، حالات، جذباتی کیفیات، اسباب و وجوہات، یوں سمجھیے کہ خدا کیسے ملا؟ کی داستان رنگا رنگ بن جاتی ہے اور افسانوں اور ناولوں سے زیادہ دل چسپ ہو جاتی ہے۔

کتاب کی تدوین میں اگر کہانی کا عنوان موضوعاتی بنایا جاتا اور نام اور تفصیل آخر میں دی جاتی تو تبصرہ نگار کے خیال میں کتاب زیادہ پُرکشش ہوتی۔ مذہب یا ممالک یا زمانے کی بنیاد پر حصے بنائے جا سکتے تھے۔

اس میں راج کماری جاوید بانو بیگم کی ۱۹۲۴ء کی داستان بھی ہے۔ یوں اگرچہ پوری دنیا سے ۷۵ سالوں کا انتخاب ہے تو عبدالغنی فاروق صاحب کو ایسی ہزاروں اور داستانیں بھی مل سکتی ہیں (م - س)۔

مدیر کے نام

عبدالمالک صوفی ' جوہر آباد

چیچنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے' اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سارا عالم اسلام روس کے خلاف اعلان جہاد کر دے۔ مسلم ممالک کی افواج کس دن کے لیے ہیں' اگر مظلوم مسلمانوں کے لیے انگلی بھی نہ اٹھائیں۔ افسوس ہے کہ روس میں پاکستان کے سفیر نے بھی اسے روس کا داخلی مسئلہ قرار دیا۔ ہم کچھ نہ کریں' ان جانبازوں کے زخموں پر نمک تو نہ چھڑکیں۔

حافظ محمد ادریس ' لاہور

"چیچنیا: ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی" (اپریل ۲۰۰۰ء) اپنے موضوع پر ایک بھرپور اور جامع تحریر ہے۔ تاہم صدر روس پوٹین کا خود اپنے بارے میں تبصرے کا اردو ترجمہ بھی دیا جاتا' تو انگریزی نہ جاننے والے بھی لطف اندوز ہوتے کہ موصوف نے اپنی کتنی سچی تصویر دکھائی ہے یعنی: میں غنڈہ ہوں' کوئی لیڈر نہیں۔ حقیقی معنوں میں بدمعاش!!

سلیم منصور خالد ' گوجرانوالہ

"خواتین کی طاقت: بیسویں صدی کا فریب" (اپریل ۲۰۰۰ء) جیسے اہم اور وسیع موضوع پر ڈاکٹر عبدالمغنی کی تحریر نہایت تشنہ ہے' کچھ گنجلک بھی لگی۔ کاش کوئی صاحب علم و قلم' مرد یا خاتون اس موضوع کا حق ادا کرے!

شبیر احمد میوانی ' لاہور

"مسلمانوں کا ذوق کتاب داری" (اپریل ۲۰۰۰ء) میں وحید اللغات کے مصنف کا نام وحیدالدین حیدر آبادی چھپ گیا ہے (ص ۴۲)' جب کہ ان کا نام وحیدالزماں تھا۔ انھیں مملکت حیدر آباد دکن سے "وقار نواز جنگ" کا خطاب بھی ملا تھا۔ وحید اللغات کو بعد میں کراچی کے ایک ادارے نے لغات الحدیث کے نام سے شائع کیا تھا۔

غلام نبی لون ' ریاض' سعودی عرب

میں تقریباً پانچ سال سے ترجمان القرآن پڑھ رہا ہوں۔ یہ واقعی بہت معلوماتی رسالہ ہے۔ "اخبار امت" (مارچ ۲۰۰۰ء) میں الجزائر کے بارے میں ایک تحریر جو ایک تحقیقی رپورٹ کا مختصر تعارف ہے' نظر سے گزری۔ اس رپورٹ کا کوئی انتخاب بھی قارئین کے سامنے آنا چاہیے۔ اس نوعیت کا تحقیقی کام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے تحقیقی اداروں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔

نبی احمد وڑائچ ' سنٹرل جیل ' گوجرانوالہ

ترجمان القرآن میں "سنابل العلم" کی دعوت فکر و عمل نظر سے گزرتی رہتی ہے۔ ایک دینی جریدے میں جدید سوشل سائنسز بالخصوص نفسیات اور انتظامیات سے متعلق ایسی رہنمائی کی اشاعت انتہائی خوش آیند ہے۔

زاہد رشید ' کراچی

"سزائے قید: جدید قانون سازی کی ضرورت" (مارچ ۲۰۰۰ء) بقول غالب: میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے--- اس مضمون میں ڈاکٹر طفیل ہاشمی صاحب نے اسلامی تعلیمات کی درست تشریح کی ہے اور سزائے قید کو غیر اسلامی قرار دے کر عہد حاضر میں اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ہماری جیلیں جرائم اور دہشت گردی کی تربیت گاہ ہیں جہاں مجرم تربیت پا کر چور سے ڈاکو بنتے ہیں۔ جس ملک میں تعلیم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہو' بے روزگاری کا سیلاب بلا اپنا دامن وسیع تر کرتا چلا جا رہا ہو' جرائم میں دن رات اضافہ ہو رہا ہو اور ملک کے قوانین کو معزز شہری روندتے پھریں وہاں "قید" کی سزا مظلوم اور پُرامن عوام کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق اور بڑی ناانصافی ہے۔ کاش ہمارے حکمراں اس پر غور کریں!

ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی ' مدیر ماہنامہ زندگی نو ' دہلی

میری بھی خواہش ہے کہ بعض اہم مضامین ترجمان القرآن اور زندگی نو میں بہ یک وقت شائع ہوں۔ آپ کا مضمون "ترقی اور انتشار عظیم" مئی کے شمارے میں آجائے گا--- یہاں کے تحریکی حلقے زندگی نو کی کھلے پن کی روش کو پسند کر رہے ہیں۔ انتشار کے بجائے اس سے استحکام ہو رہا ہے۔ دعا کیجیے کہ اس سے تحریکی جدوجہد کو فائدہ پہنچے۔ اگر بے راہ روی نقصان دہ ہے تو جمود بھی مضر ہے۔ دونوں سے بچنے کی راہیں سوچنا چاہیے۔
